دسمبر 2020ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

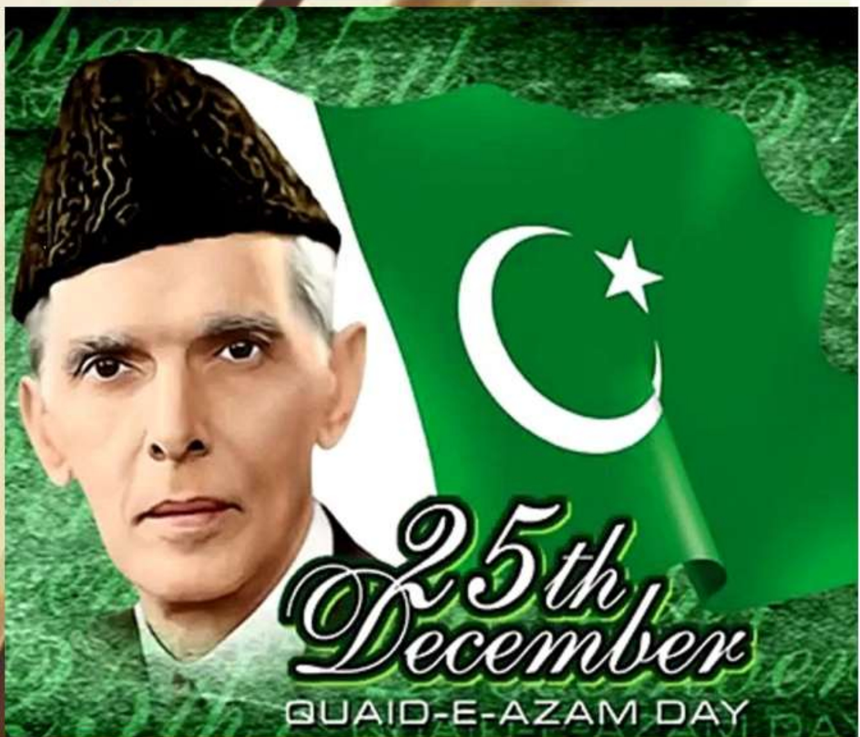

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

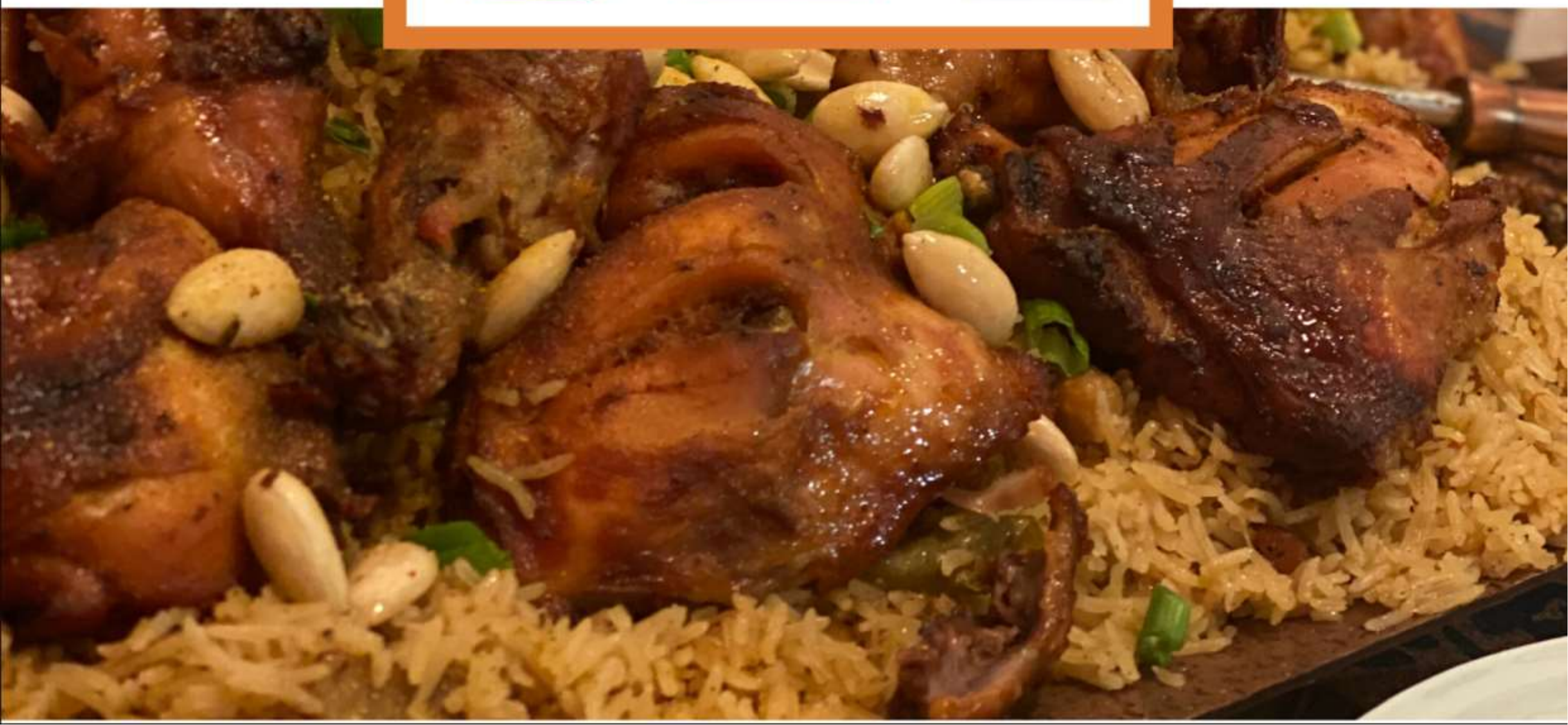

اس شمارہ میں

04 درسِ قرآن کریم
05 مقصد، نصب العین اور عدل
07 جناح کراچی میں پیدا ہوئے یا ٹھٹھہ میں؟
08 سابق وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی نا اہلی، اور پھیلائے قصے
10 بھوپال کی تاریخی اقبال لائبریری کا نوحہ کیا لکھوں
11 بی اماں: تحریک خلافت کی سرگرم کارکن اور علی برادران کی والدہ آبادی بیگم کون تھیں؟
13 قومی المیہ تعلیم حاصل کرنا یا جانور چرانا
15 پاکستان کو خونی انقلاب کی نہیں تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے
16 کفر کے فتوے اور قتل کی وارداتیں
17 اپنے اپنے قد کے برابر کا اقبال
18 مسلمانوں کا بہت کچھ یا شاید سب کچھ چھن گیا ہے
20 لفافہ مولویوں کا بورڈ بننے کی خواہش اور نواز شریف امیر المومنین
21 ڈاکٹر عبدالسلام کا نوبیل انعام یافتہ الیکٹرو ویک نظریہ: کائنات کے ابتدائی مراحل کا احاطہ کرنے والی تھیوری کیا تھی اور یہ کیوں اہم ہے؟
23 علامہ خادم رضوی اور عبدالستار ایدھی
24 میر گل خان نصیر مصور بلوچستان
25 اسپ لیلیٰ: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وہ گھوڑی جس کے حصول کے لیے 12 ہزار جانیں داؤ پر لگیں
33 علامہ خادم کی وفات اور احمدی ڈاکٹر کا قتل: قومی سانحہ اور انسانی المیہ میں فرق
35 بھکاری
37 'مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دور مذہبی مساوات کا نمونہ'
39 پاکستان امریکی دوستی کے کیسینو میں کیسے داخل ہوا؟
41 روسو اور ڈیوڈ ہیوم کی دوستی کیوں نہ چل سکی
43 بے چارہ کنگلا جو بائیڈن
44 شہزادی ثروت الحسن: اُردن کے شہزادے حسن بن طلال کی پاکستانی لڑکی ثروت اکرام اللہ سے افسانوی شادی کی داستان
47 لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ
52 ہماری اسلامی تحریکیں کب تک اندھیرے میں رہیں گی؟
54 مسلمانوں کے عروج و زوال میں نظریۂ علم کا کردار
57 اردو ادب میں ناول کا ارتقاء اور آج کے ناول نگار
60 ڈپٹی نذیر احمد

ADVERTISEMENT TARIFF

(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

ھُوَالـــــــــــــــــــــناصر

بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم — گر کُفر ایں بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 5 شمارہ نمبر: 12 ربیع الثانی 1442 دسمبر 2020ء

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

ایڈیٹر
منزہ خان

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-6433112

عابد شمعون چاند (سعودی عرب)

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

رحمت اللہ میر بلوچ (بیورو چیف بلوچستان)

محمد ثناء اللہ (بیورو چیف وسطی پنجاب)

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com

m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

درس قرآن کریم

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۔
(سورہ البقرہ:214)

ترجمہ:

تمام انسان ایک ہی امت تھے۔ پس اللہ نے نبی مبعوث کئے اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والے تھے اور انذار کرنے والے تھے۔ اور ان کے ساتھ حق پر مبنی کتاب بھی نازل کی تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ کرے جن میں انہوں نے اختلاف کیا۔ اور اس (کتاب) میں اختلاف نہیں کیا مگر باہم بغاوت کی بنا پر انہی لوگوں نے، جنہیں وہ دی گئی تھی، بعد اس کے کہ کھلی کھلی نشانیاں ان کے پاس آچکی تھیں۔ پس اللہ نے ان لوگوں کو اپنے اِذن سے ہدایت دیدی جو ایمان لائے تھے بسبب اس کے کہ انہوں نے اس میں حق کے باعث اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔(1)

(1) کسی نبی کے آنے سے پہلے سب لوگ ایک ہی جیسے ہو جاتے ہیں۔ خواہ بظاہر پہلے انبیاء پر ایمان بھی لاتے ہوں لیکن فسق و فجور اور بداعمالی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پس یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ نبی کے آنے سے پہلے امتیں ایک ہی حال پر ہوتی ہیں خواہ بظاہر مومن یا غیر مومن ہوں۔ جب نبی کی طرف سے کتاب اور امر و نواہی کی کھلی کھلی وضاحت ہو جائے پھر اس کا نبی سے اختلاف انسانوں کو دو حصوں میں الگ الگ کر دیتا ہے۔ ایک وہ جو نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ایک وہ جو نبی کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر:

لوگوں کا دین ایک تھا۔ پھر بھیجے اللہ نے نبی خوشی اور ڈر سنانے والے اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصل کرے لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً: نیک و بد تو دنیا میں ہوتے ہیں مگر ایک وقت لوگوں پر ایسا آتا ہے کہ ان میں سے غیرتِ ایمانی اُٹھ جاتی ہے اور وہ مذہبی بحثوں کو فساد جاننے لگتے ہیں۔ ایک مصنف فخر کے طور پر کہتا ہے کہ میرا ایک دوست بڑا پیارا تھا تیس برس سے ملاقات چلی آتی ہے اور میں نے کبھی اس کے سامنے خدا کا نام نہیں لیا۔ أُمَّةً وَاحِدَةً کے میرے نزدیک یہی معنی ہیں کہ بے غیرت ہو کر ایک رنگ میں رنگین ہو جانا۔ ایسے وقت میں اللہ کے مامور آتے ہیں۔

چنانچہ فرماتا ہے

فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ نبیوں کو مبعوث کرتا ہے۔ بَغْيًا بَيْنَهُمْ: یعنی محض ضد کی وجہ سے نہیں مانتے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ دن پہلے مسیلمہ کذّاب نے پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ ایک صحابہؓ کا آشنا مسیلمہ کا مرید تھا۔ اس سے پوچھا گیا تم نے مسیلمہ کو کیوں مان لیا اور محمد رسول اللہ ﷺ میں کیا نقص دیکھا تو وہ کہنے لگا اَكْذَبُ بَنِیْ یَمَامَۃَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَصْدَقِ قُرَیْشٍ۔ قریش خواہ کیسا راست باز ہو آخر قریشی ہے اس سے مجھے اپنی قوم کا اَكْذَبُ اچھا۔ پس یہ وجہ ہوتی ہے اختلاف کی۔

میں کل بتلا چکا ہوں کہ جس حصہ میں انسان کا دخل نہیں اس میں شریعت نازل نہیں ہوتی اور جس میں دخل اور اختیار ہے اس میں شریعت ہے۔ قانونِ سرکاری اور شریعت میں یہ فرق ہے کہ قانونِ گورنمنٹ اس وقت گرفتار کر سکتا ہے جب گناہ کا اثر کسی دوسرے پر عملی رنگ میں پڑے مگر شریعت گناہ کے مبدء کو پکڑتی ہے مثلاً بدنظری ہے۔ اب پولیس اسے نہیں پکڑتی لیکن شریعت نے یہ برکت کا کام دنیا میں کیا ہے کہ جو شخص شریعت پر عمل پیرا ہو وہ پولیس کے ہاتھ میں آتا ہی نہیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً: اس کی تفسیر سورہ یونس (آیت:20) مَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا میں ہے۔ كَانَ حرف ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ سب کافر تھے یا سب مومن بلکہ یہ کہ انسان بحیثیت انسان ایک گروہ ہے جیسے کتے الگ گھوڑے الگ۔

(حقائق الفرقان جلد اوّل صفحہ نمبر 348)

❀❀❀

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

اداریہ

مقصد، نصب العین اور عدل

یہ تین باتیں کسی انسان اور قوم کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جب ارادہ کیا جائے اس کو مقصد یا مقصدیت کہتے ہیں۔نصب العین مقصدِ اعلیٰ کو بھی کہتے ہیں۔ حوصلہ رکھنا، کسی چیز کو حاصل کرنا، تلاش کرنا نصب العین اور عدل کے معنی انصاف کرنے کے ہیں۔

زندگی گزارنے کے لئے ہر انسان کا کوئی نہ کوئی مقصد ارادہ اور نصب العین ہوتا ہے اسی طرح کسی قوم کے لئے بھی اس کے بغیر زندگی بے معنی اور فضول ہے۔ایک کامیاب معاشرہ کے تصور اور عام انسان کی زندگی کے لئے اس کا تعین کرنا بہت ضروری امر ہے۔آج جن قوموں نے دنیا میں ترقی اور بلند مقام حاصل کیا ہے یہ ان کے بنیادی اصول تھے۔ قیادت کا بنیادی مقصد انسانوں کی درست رہنمائی اور انکے مسائل کا آسان حل فراہم کرنا ہوتا ہے۔ باشعور، باصلاحیت اور دیانت دار قیادت نہ صرف انسانی مسائل کے حل میں ہمیشہ مستعد و سرگرم رہتی ہے۔ بلکہ معاشرے کی خوشحالی، امن اور ترقی میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

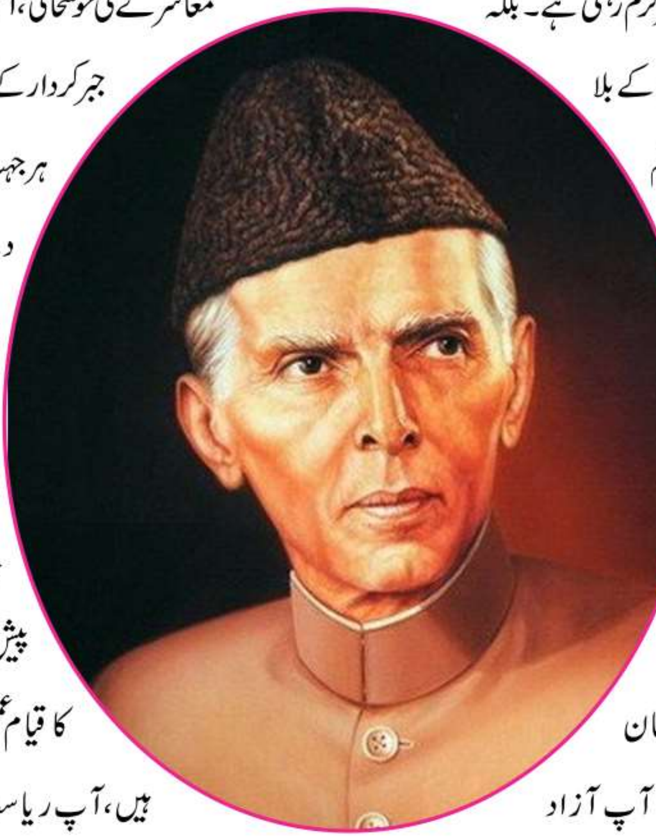

قیادت متعین مقاصد کے حصول کے لئے عوام کے بلا جبر کردار کے مجموعہ کو قیادت کہتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پیارے نبی اکرم ﷺ ہر جہت سے مسلمانوں کے سرپرست و رہبر تھے۔ آپ ﷺ نے ہمیں دنیا کے بہترین اصول دیئے اور خود ان پر عمل کر کے دنیا کو بتایا کہ اسی سے ایک عام شہری، معاشرہ اور قومیں ترقی پاسکتی ہیں۔

قائدِ اعظم یعنی سب سے عظیم رہبر کو بابائے قوم یعنی قوم کا باپ بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک مقصد اور نصب العین کے تحت برصغیر پاک و ہند میں ایک لمبی سیاسی جدوجہد کی۔1940ء میں محمد علی جناح نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک علیحدہ وطن کے لئے قراردادِ پاکستان پیش کی جس کا مقصد نئی مملکت کے قیام کا مطالبہ تھا۔جس کے بعد 14 راگست 1947ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔آپ نے 11 اگست کو کراچی میں اسمبلی کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا! آپ آزاد ہیں، آپ ریاست پاکستان میں آزاد ہیں کہ چاہیں تو اپنے مندر میں جائیں یا مسجد میں اور یا اپنی کسی دوسری کی عبادت گاہوں پر، آپ کا تعلق بھلے کسی مسلک یا عقیدے سے ہو۔اس سے ریاست کا کوئی لینا دینا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے سامنے اس بات کو نظریہ سمجھ کر رکھنا چاہئے اور آپ دیکھیں گے کہ ہندو، ہندو اور مسلمان مسلمان رہیں گے۔ کیونکہ یہ ہر انفرادی بندے کا ذاتی عقیدہ ہے۔ جبکہ سیاسی نظر میں وہ ریاست کے شہری ہیں۔ ہمارے قائد بانئ پاکستان کا یہ وہ مقصد، نصب العین تھا اور عدل سے انہوں نے ایک عام شہری اور معاشرہ کو جو پیغام دیا وہ وہی کرسکتا ہے جو قوم اور ملک کے ساتھ مخلص، دیانتدار اور وفا شعار ہو۔ آج ہمیں قائد کے علاوہ کوئی رہبر اور رہنما میسر نہیں چراغ لے کر ڈھونڈیں تب بھی نظر نہیں آئے گا۔ ہمارے ملک کا بڑا مسئلہ مذہبی انتہا پسندی ہے ان کے رہنماؤں نے فرقہ واریت کو خوب ہوا دی اور پاکستانی قوم کو منتشر کر دیا۔ ان کو قائد کے نصب العین سے ہٹا دیا اس میں سیاست دانوں کی مصلحت اور مفاہمت کی سیاست پروان چڑھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج عام شہری

خوف اور پریشانی کا شکار اور فکر مند ہے۔ افسوس کہ عدل کا نظام کہیں نظر نہیں آتا۔ شعبہ ہائے زندگی میں اس کا فقدان ہے ریاست، عدالتیں، پولیس اور دیگر ذمہ دار ادارے بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ آئے دن بچوں کا اغوا، معصوم بچیوں کے ساتھ زیادتیاں، قتل و غارت اور اقلیتوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات روز کا معمول بن چکے ہیں۔ ایک ماہ میں تین احمدیوں کا قتل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ریاست پاکستان اپنے شہریوں کو تحفظ فراہم نہیں کرسکتی اور وہ مذہبی انتہاء پسندی کو روکنے میں ناکام ہے اسی لئے آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے جارہے ہیں۔

جس فلاحی معاشرہ میں عادلانہ نظام موجود نہ ہو وہ ریاست مدینہ کا نعرہ کیسے لگا سکتی ہے۔ اصل ریاست مدینہ میں تو عیسائی، یہودی اور دیگر اقوام ایک ساتھ رہتی تھیں اور خوشحال تھیں۔ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ان 70 سالوں سے ہمیں ہر حکومت نے نیا نعرہ دے کر نا سمجھ عوام کو اپنے پیچھے لگا یا ہوا ہے۔ پاکستانی سیاست میں جھوٹ، دھوکہ، فریب، مصلحت مفاہمت کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن یاد رکھیں جب خدا تعالیٰ کی طرف سے پکڑ آتی ہے تو کسی کو چھپنے کی جگہ نہیں ملتی اور مکافاتِ عمل کے واقعات پاکستان کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ پچھلے حکمرانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا کیا ہم سب بھول گئے؟ ایک نہ ایک دن سب کو انصاف کے کٹہرے میں آنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی سورۃ المائدہ آیت :9 میں فرماتا ہے۔ ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر مضبوطی سے نگرانی کرتے ہوئے انصاف کی تائید میں گواہ بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہرگز اس بات پر آمادہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ کے سب سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ اس بات سے ہمیشہ باخبر رہتا ہے جو تم کرتے ہو۔ علاوہ ازیں المطففین کی سورۃ میں میزان کی طرف انسان کو متوجہ فرمایا گیا ہے کہ تم تبھی کامیاب ہو سکتے ہو اگر عدل پر قائم ہو۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے پیمانے اور ہوں اور بانٹنے کے پیمانے اور۔ اس میں اس دور کی تجارت کا بھی تجزیہ فرما دیا گیا ہے۔ بڑی بڑی قومیں جب بھی غریب قوموں سے سودا کرتی ہیں تو لازماً اس سودے میں ہمیشہ غریب قوموں کا نقصان ہوتا ہے۔ فرمایا۔ کیا یہ لوگ سوچتے نہیں کہ ایک بہت بڑے حساب کتاب کے دن وہ اکٹھے کئے جائیں گے۔ جس میں ان دنیا کے سودوں کا بھی حساب ہوگا یہ وہ یومُ الدّین ہے جس کا ذکر فرما کر متنبہ کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ بھی حکم ہے کہ اگر تمہیں اپنے عزیز (قریبی) رشتہ داروں کے خلاف بھی گواہی دینی پڑے تو دیں یہی عدل و انصاف ہے۔ اور یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ریاست کے اداروں، سیاستدانوں، مذہبی رہنماؤں اور ہر شہری کو متعین کردہ مقصد، نصب العین اور عدل و انصاف کو مدِنظر رکھنا ہوگا۔ ان اصولوں پر اجتماعی طور پر عمل کرنے سے من حیث القوم ترقی ہوسکتی ہے ورنہ سب کچھ بہہ جائے گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی قومیں ایک تو مجرم کہلاتی ہیں دوسرا وہ ماضی کا قصّہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا ان ریاست کے اداروں سے نیک دلی، عاجزی اور مؤدبانہ درخواست ہے کہ بانئ پاکستان کی تحریک، جدوجہد، ان کے اصولوں کو فراموش اور پامال نہ کریں ورنہ تاریخ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اب اصلاح کے لئے اوپر سے کوئی نہیں آئے گا جنہوں نے آنا تھا آگئے انہی کی باتوں پر عمل کریں۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو آمین۔ ❁❁❁

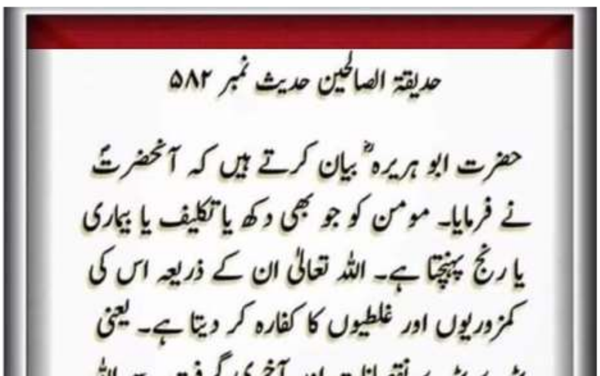
حدیقۃ الصالحین حدیث نمبر ۵۸۲

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ مومن کو جو بھی دکھ یا تکلیف یا بیماری یا رنج پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ اس کی کمزوریوں اور غلطیوں کا کفارہ کر دیتا ہے۔ یعنی بڑے بڑے نقصانات اور آخری گرفت سے اللہ تعالیٰ اس کو بچا لیتا ہے۔

مسلم کتاب البر و الصلۃ باب ثواب المومن فیما یصیبہ

جناح کراچی میں پیدا ہوئے یا ٹھٹھہ میں؟

تحریر: ریاض سہیل

بانی پاکستان محمد علی جناح کراچی میں پیدا ہوئے یا ٹھٹھہ کے علاقے جھرک میں؟

صوبہ سندھ کی اسمبلی میں منگل کو اس معاملے پر بحث ہوئی لیکن پیدائش کے 138 سال کے بعد شروع ہونے والی یہ تکرار کسی منطقی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ متحدہ قومی موومنٹ کے پارلیمانی رہنما سید سردار احمد نے نکتۂ اعتراض پر ایک سرٹیفکیٹ ایوان میں پیش کیا جس کے مطابق محمد علی جناح کی پیدائش کراچی میں ہوئی تھی۔ سندھ کے سابق سینیئر بیوروکریٹ سید سردار احمد نے غلام علی الانا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے لکھا تھا کہ محمد علی جناح اس دھرتی پر پیدا نہیں ہوئے، اور اس کے علاوہ کئی تحریروں میں کہا گیا ہے کہ جناح کراچی میں نہیں بلکہ جھرک میں پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کے پاس جو سرٹیفکیٹ ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش کراچی میں ہی ہوئی تھی۔

سید سردار احمد نے محمد علی جناح کی 25 اگست 1947ء کی تقریر کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ جناح نے خود کہا تھا کہ ان کی پیدائش کراچی میں ہوئی ہے، لہٰذا اب یہ بحث ختم ہونی چاہیے۔ انھوں نے ایوان کو بتایا کہ اس وقت کراچی ڈسٹرکٹ سہون تک پھیلا ہوا تھا جبکہ جھرک کراچی کی ایک تحصیل تھی، اگر اس بات کو نہیں تسلیم کیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ ہم محمد علی جناح کے بیان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ سینیئر صوبائی وزیر نثار کھوڑو کا کہنا تھا کہ یہ تاریخی ریکارڈ ہے کہ محمد علی جناح کی پیدائش جھرک میں ہوئی تھی۔ ان کے مطابق ہوسکتا ہے کہ جھرک اس وقت کراچی کا حصہ ہو۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ایوان کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو ریکارڈ کا جائزہ لے کر بتائے کہ جناح کی پیدائش کہاں ہوئی۔ صوبائی وزیر سکندر مندھرو نے ایوان کو بتایا کہ جناح نے سندھ مدرسۃ السلام میں دو جماعت تعلیم حاصل کی، اس کے بعد وہ ممبئی اور وہاں سے لندن چلے گئے، جہاں انھوں نے اپنا نام تبدیل کر دیا، یہ سب کچھ ریکارڈ کا حصہ ہے۔ سندھ کے محکمۂ ثقافت کی وزیر شرمیلا فاروقی کا کہنا تھا کہ سندھ کے نامور محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے بھی اس پر تحقیق کی ہے اور ان کے محکمے کے پاس اس کا مواد دستیاب ہے، جو وہ ایوان کو فراہم کر سکتی ہیں۔ سید سردار احمد نے کمیٹی کی تشکیل سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ بات واضح ہے کہ کمیٹی بنانے کی ضرورت نہیں، اس طرح یہ بحث کسی نقطے پر پہنچے بغیر عارضی طور پر مؤخر ہوگئی۔ یاد رہے کہ سندھ کے سرکاری نصاب میں برسوں سے طالب علموں کو یہ پڑھایا گیا کہ محمد علی جناح کی پیدائش ٹھٹھہ کے علاقے جھرک میں 25 دسمبر 1876ء کو ہوئی تھی۔ دوسری جانب سندھ اسمبلی میں متحدہ قومی موومنٹ نے کارکنوں کی مبینہ طور پر ماورائے عدالت ہلاکت کے خلاف مذمتی قرارداد پیش کرنا چاہی لیکن سپیکر نے انھیں اجازت نہیں دی جس پر ایم کیو ایم کے اراکین نے احتجاج کیا اور ایجنڈے کی کاپیاں پھاڑ دیں۔ احتجاج کے دوران تحریک انصاف کے رکن خرم شیر زماں کی ایک قرارداد منظور کر لی گئی، جس میں الیکشن کمیشن سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ بلدیاتی اور عام انتخابات بائیو میٹرک نظام کے تحت منعقد کیے جائیں۔

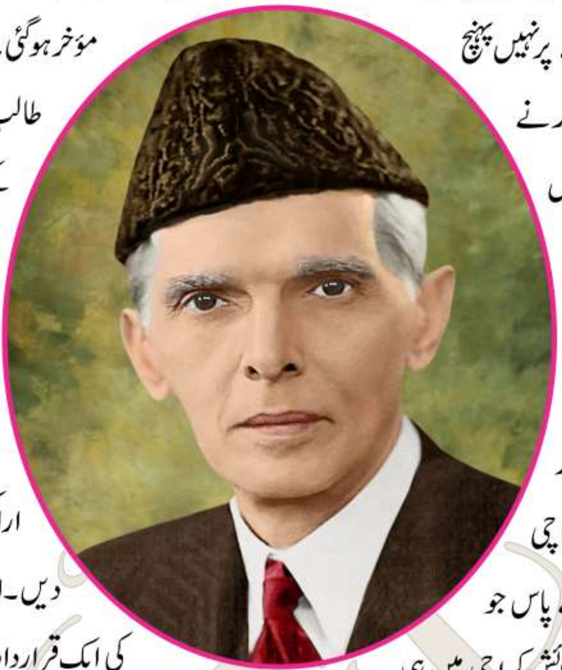

❁❁❁

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

شعبہ پاکستان

سابق وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی نااہلی، اور پھیلائے قصے

تحریر: اختر بلوچ

سابق وزیراعظم نواز شریف کو عدالتِ عظمیٰ نے اپنے ایک فیصلے کے تحت معزول کر دیا۔ پاکستان کے اکثر میڈیا گروپس کے ٹی وی چینلز اور اخبارات میں انھیں سابق وزیراعظم لکھا جاتا ہے اور اسی لقب سے پُکارا جاتا ہے۔ لیکن ایک، دو میڈیا گروپ انھیں اپنے ہر پروگرام یا نیوز بلیٹن میں ”سابق نااہل“ وزیراعظم کے لقب سے پکارتے ہیں۔ یہ اندازِ تحریر اور تخاطب اور یہ لب ولہجہ اس حد تک موزوں ہے، یہ ایک بحث طلب امر ہے۔ اس پر ایک طویل مباحثے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف وزرائے اعظم جن حالات اور جن وُجوہات کی بنا پر برطرف یا معزول کیے گئے تو کیا اُن سب کو، ان وجوہات کی بنا پر ان کو سابق مقتول وزیراعظم، سابق قاتل وزیراعظم، سابق توہینِ عدالت کے مرتکب وزیراعظم لکھا جانا چاہیے یا صرف سابق وزیراعظم۔ یہ بھی ایک بحث ہوسکتی ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے جن ججوں نے ان وزرائے اعظموں میں سے کسی ایک کو سزا دی اور بعد میں اس بات کا اقرار بھی کیا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ کے تحت کیا تھا تو ان ججوں کو سابق بزدل جج لکھنا چاہیے۔ یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا آغاز ہم کر رہے ہیں۔ آیئے اس ضمن میں سب سے پہلے پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کا ذکر کرتے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کو جب وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کیا گیا تو اس کا آنکھوں دیکھا حال نعیم احمد، محمد ادریس اور عبدالستار کی مرتبہ کتاب ”پاکستان کے پہلے وزرائے اعظم“ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

جب غلام محمد نے آپ کو برطرف کیا اس دن آپ دورے پر جانے والے تھے۔ جب آپ کو برطرفی کا علم ہوا تو آپ نے بجائے کوئی سیاسی انتقامی کارروائی کے خاموشی سے سب کچھ برداشت کیا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ تاثر تھا کہ خواجہ صاحب سے دھوکہ کرنے والوں میں وہ لوگ شامل تھے جن پر آپ بھروسہ کرتے تھے یعنی چودھری محمد علی اور اسکندر مرزا، لیکن آپ یا تو اتنے بزدل تھے یا شریف کہ آپ نے اپنی برطرفی پر کوئی بیان تک نہ دیا۔ آپ جب برطرفی کے بعد وزیراعظم ہاؤس سے رخصت ہونے لگے تو افسردہ نظر آ رہے تھے اور آنسو آپ کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ البتہ آپ نے اتنا ضرور کہا کہ ”یہ اچھا نہیں ہوا۔ یہ پاکستان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اگر اس حوالے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک بات بالکل واضح ہے کہ وزیراعظم ہاؤس کے جن تین ملازمین نے یہ کتاب مرتب کی ہے اس میں ایک بات انھوں نے مِن وعَن بیان کی ہے کہ جب وہ ایوانِ وزیراعظم سے رخصت ہو رہے تھے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے، نہ جانے یہ بزدلی تھی یا کہ شرافت۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کا سابق بزدل وزیراعظم لکھا جائے یا شریف وزیراعظم لکھا جائے۔ خواجہ ناظم الدین کی خوش خوراکی کے چرچے قیامِ پاکستان سے قبل بھی عام تھے، اور اس کے بعد بھی رہے لیکن عمومی طور پر اس بات کو ان کے خلاف پروپیگنڈہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب ”قائداعظم محمد علی جناح میری نظر میں“ کے صفحہ نمبر 136، 137 پر یوں بیان کیا ہے:

مجھے یاد ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رُکن اور بنگال کے ایک محترم سیاسی رہنما خواجہ ناظم الدین اپریل 1946 کے پہلے ہفتے میں نئی دہلی میں سخت بیمار پڑ گئے اور ایک ہلکے سے دورہ قلب کے بعض آثار نمایاں ہوگئے۔ انھیں فوراً اسپتال پہنچایا گیا اور ایک پرائیویٹ مریض کے طور پر داخل کر دیا گیا۔ ہم لوگ مسٹر جناح کے مکان پر جمع تھے کہ ہم نے یہ خبر سنی کہ اُن کی بیماری خطرناک ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے بیمار دوست اور رفیق کار کو جا کر دیکھیں۔ ہم نے مسٹر جناح کو اسپتال جانے کی اس تجویز سے مُطلع کیا اور ان سے پوچھا کہ آیا وہ بھی خواجہ ناظم الدین کو دیکھنا پسند کریں گے۔ ہم ان کا جواب سُن کر دم بخود رہ گئے کہ اگر انھوں نے ایک مرتبہ بیمار اور علیل لوگوں کی عیادت کو جانا شروع کر دیا تو انھیں اپنا زیادہ تر وقت اسی فریضے کی ادائیگی میں صرف کرنا پڑے گا۔ ان کے پاس اس اہم کام کے لیے کافی وقت نہ بچے گا جس پر برِصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنی توجہ

پھر کاغذات کے اُس ڈھیر کی طرف کر دی جو ان کے دارالمطالعہ کی ایک سبز چمڑے کی کُرسی کے اردگرد جمع تھا۔ ہم ان کے کمرے سے مایوس نکل آئے اور اسپتال پہنچے۔ جہاں ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب اپنے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ اور بالکل خوش وخرم ہیں۔ انھوں نے ہمیں یہ خوشخبری دی کہ ان کے دل میں کوئی خرابی نہ ہوئی تھی بلکہ انہیں بدہضمی کی شکایت ہوگئی تھی جس کا باعث کھانے میں بدپرہیزی تھی۔ نعیم احمد، محمد ادریس اور عبدالستار کی مرتبہ کتاب ''پاکستان کے پہلے وُزرائے اعظم'' میں خواجہ ناظم الدین کی خوراک کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ وہ بِسیار خور نہ تھے لیکن کتاب میں ان کے کھانے کی جو فہرست فراہم کی گئی ہے اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ مرتبین کے مطابق:

آپ کے متعلق عوام میں عام طور پر یہ مشہور کیا گیا کہ خواجہ صاحب پیٹو قسم کے انسان ہیں اور بہت کھاتے ہیں لیکن وزیراعظم کی حیثیت میں انھیں زیادہ کھانے والا انسان نہیں پایا گیا۔ کھانے میں جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے اگرچہ کئی اشیاء یعنی مچھلی، گوشت، چاول، دال ضرور ہوتی تھیں لیکن خواجہ صاحب کی خوراک زیادہ نہیں تھی۔

مرتبین اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

لنچ پر اکثر گوشت کے دو قسم کے سالن ہوتے تھے اس کے علاوہ مسور کی پتلی دال اور ابلے ہوئے موٹے چاول بھی دوپہر کے کھانے کی میز پر ضرور ہوتے تھے۔ مسور کی دال اور چاول خواجہ صاحب کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ مچھلی بھی پسند فرماتے تھے۔ سالن میں سرسوں کے تیل کا زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ آپ کے اگرچہ تمام دانت نقلی تھے لیکن کمال یہ تھا کہ آپ ان دانتوں سے ہڈی بھی چبا لیتے تھے۔ دوپہر اور شام کے کھانوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ مچھلی، چاول، دال، مرغی دونوں کھانوں میں ضرور شامل ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کو چنے کی دال اور گوشت کا سالن بھی بہت پسند تھا۔ آپ کبھی کبھی سوڈا واٹر کا استعمال بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھار انگریزی کھانے بھی کھا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ پالک کا ساگ، فرانس بین، مٹر اور آلو جیسی سبزیاں بہت پسند تھیں۔ وہ تنہائی میں کھانا پسند نہیں فرماتے تھے، ہمیشہ کھانے کی میز پر ان کا پورا گھرانہ اور وہ مہمان جو اکثر ڈھاکہ سے آئے ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کی کوشش یہ ہوتی تھیں کہ دوسروں کو کھلائیں۔ وہ بذاتِ خود کھانے کی پلیٹیں اٹھا اٹھا کر مہمانوں کے پاس لے جاتے اور اصرار کرتے کہ اور کھاؤ۔ مشہور ہے کہ آپ کو مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ یہ بات کافی حد تک ٹھیک ہے۔ آپ نے ایک بار ایک مرغ انگلینڈ سے منگوایا۔ جس فلائٹ میں وہ مرغ آرہا تھا آپ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جب فلائٹ کے آنے کی تصدیق ہوگئی تو آپ بذات خود ڈاکٹر نورالاسلام کو ساتھ لے کر ہوائی اڈے پہنچ گئے اور مرغ کو اپنے ہمراہ لے کر آئے۔ ایک اندازے کے مطابق آپ کے پاس تقریباً نہایت اچھی قسم کی چار سو کے قریب مرغیاں ہوں گی۔ مرغی خانے کی دیکھ بھال کے لیے باقاعدہ ایک آدمی مقرر کیا ہوا تھا۔ اس سے اکثر مرغیوں کی صحت اور خوراک وغیرہ کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے جب بھی مرغی کا کوئی انڈا ڈربے میں پڑا دیکھتے تو اس کو اٹھا کر بہت خوش ہوتے تھے اور اس کے سائز کے بارے میں تبصرہ بھی کرتے تھے۔ پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب ''رُودادِ چمن'' کے صفحہ نمبر 52 پر لکھتے ہیں:

میں جب سندھ کا ریونیو وزیر بنا تو وہ میرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کو تھوڑا سا غیر آباد زمین کا ٹکڑا سندھ میں دیا جائے، جہاں وہ مرغبانی کر کے فاقہ کشی سے بچنے کا بندوبست کر سکیں۔ زمین تو میں نے دے دی مگر مرغی خانہ نہ بن سکا۔ مجبوراً دربدر خاک بسر وہ اپنا یہ حال لے کر ڈھاکہ پہنچے اور وہاں پاکستان کے دوست یا دشمن قائداعظم کے اس قریبی ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر انگشتِ بدنداں رہ گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کو سابق وزیراعظم کے حوالے سے کیا لکھا اور پکارا جائے۔ سابق آبدیدہ وزیراعظم، سابق بزدل وزیراعظم، سابق مرغبان وزیراعظم یا سابق مظلوم وزیراعظم۔ یہ تو تھے خواجہ ناظم الدین جن کے لیے کیا القاب استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن اگر قارئین کے ذہن میں کوئی اور القاب ہوں یا کوئی اور کہانی ہو تو وہ یہاں لکھ سکتے ہیں اس سے ہمیں بھی رہنمائی حاصل ہوگی۔ یاد رہے کہ یہ صرف ایک سابق وزیراعظم کا قصہ ہے، ہماری کوشش ہے تمام سابق وزرائے اعظم کے بارے میں لکھیں۔ بشکریہ: تجزیات آن لائن

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی
توسیع اشاعت میں حصہ لینا
آپ کا قومی فرض ہے۔

بھوپال کی تاریخی اقبال لائبریری کا نوحہ کیا لکھوں

تحریر: رضا علی عابدی

علم کا ایک اور سفینہ ڈوب گیا۔ بھوپال کی تاریخی اقبال لائبریری کو پچھلے دنوں کی بارش نگل گئی۔ اگست کا آخری ہفتہ تھا۔ ایک روز بادل ٹوٹ کے برسا۔ کہتے ہیں صرف ڈیڑھ گھنٹے کی جھڑی لگی۔ جب بند ہوئی تو منظر یہ تھا کہ کمر کمر پانی میں ڈوبا اقبال لائبریری کا سراسیمہ عملہ کتابوں اور رسالوں کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں آدھی آدھی ڈوب گئیں اور جب پانی اترا تو احساس ہوا کہ کتنا بھاری نقصان ہو چکا ہے۔ اس نوعیت کا یہ کوئی پہلا سانحہ نہیں۔ میں سنہ بیاسی میں ہندوستان اور پاکستان میں پرانے کتب خانوں اور کتابوں کے ذخیروں کا جائزہ لینے کئی ہفتوں کے سفر پر نکلا تھا۔ درجنوں ذخیرے تو میں نے خود دیکھے، سینکڑوں کا احوال احباب سے سنا۔ اس احوال کے بیچ کتنے ہی کتب خانوں کا ذکر آیا جو کبھی تھے، اب نہیں رہے۔ میں دعا کرتا ہوا لوٹا کہ ترقی کا دور شروع ہو چکا ہے، لوگ کتابوں کو کیڑوں مکوڑوں، آگ اور پانی سے بچانے کی تدبیریں سیکھ گئے ہوں گے، کاش اب مزید کوئی نقصان نہ ہو۔ یہ دعا مانگے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ دکن سے خبر آئی کہ حیدر آباد کے عبدالصمد کا کتابوں اور رسالوں کا نادر اور نایاب ذخیرہ موسیٰ ندی کی طغیانی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ عبدالصمد پیشے کے اعتبار سے موٹر مکینک تھے مگر انہیں قدیم کتابیں جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ برسوں کی جستجو کے بعد انہوں نے ایسا شاندار کتب خانہ قائم کر لیا جس میں پی ایچ ڈی کے طالب علم ریسرچ کیا کرتے تھے۔ یہ کتب خانہ جب میں نے دیکھا تو ایک اونچی عمارت کی چھت پر بنے عارضی سے کمروں میں قائم تھا۔ بعد میں خبر ملی کہ عبدالصمد کی ساری کتابیں اور رسالے ایک عمارت کے تہ خانے میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اس وقت کسی نے دھیان نہ دیا کہ موسیٰ ندی اس تہہ خانے سے لگی لگی بہتی ہے۔ پھر وہی ہوا جس کا خوف تھا۔ ایک رات ندی بپھری اور پانی کے ریلے نے جن ٹھکانوں کو بہا لے جانے کا قصد کیا تھا، ان میں عبدالصمد کے ذخیرے کا بڑا حصہ شامل تھا۔ اب یہ تازہ خبر دکن سے تو نہیں، بھوپال جیسی علم پرور ریاست سے آئی اور وہ بھی دل کو دکھاتی ہوئی۔ شہر کی اقبال لائبریری سنہ انیس سو انتالیس میں قائم ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ وسطی ہندوستان کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہونے لگی تھی۔ علامہ اقبال سے موسوم یہ لائبریری بھوپال کے شیش محل کے سامنے واقع ہے۔ علامہ جن دنوں بھوپال گئے تھے، انہوں نے اسی عمارت میں قیام کیا تھا۔ سیلاب سے پہلے اس کتب خانے میں کہا جاتا ہے کہ اسّی ہزار کتابیں موجود تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اردو کتابیں اور رسالوں کی بندھی ہوئی جلدیں تھیں۔ یہ سارا ذخیرہ تہہ خانے جیسے ایک ہال میں رکھا گیا تھا جو سڑک کی سطح سے نیچا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیڑھ گھنٹے کی موسلا دھار بارش اپنے ساتھ ایسا ریلا لائی کہ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اچانک سب کچھ تیرنے لگا۔ اور ایک بیان کے مطابق بے شمار کتابیں بھیگ کر لگدی بن چکی تھیں، یعنی پانی میں گھُل گئی تھیں۔ کتب خانے کے عملے نے کتابوں کو بچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ اس وقت ان لوگوں کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اب تک ایک ایک الماری کو کھول کر بچی کھچی کتابیں نکالی جا رہی ہیں مگر رکھنے اٹھانے کے عمل ہی میں کتابیں ریزہ ریزہ ہوئی جاتی ہیں۔ کتب خانے کے منتظم رشید انجم کہتے ہیں کہ ضائع ہونے والی کتابوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ جتنا ذخیرہ بچ رہا ہے اسے کسی بہتر اور محفوظ جگہ منتقل کیا جائے۔ اقبال لائبریری ایک غیر سرکاری ادارہ ہے، اس کے وسائل قلیل ہیں، عملے کو برائے نام اجرت ملتی ہے اور کئی رضا کار بلا معاوضہ کام کرتے ہیں۔ یہ لائبریری طلباء کے لیے بڑی کارآمد ہے جن کے لیے مقابلے کے امتحان سے تعلق رکھنے والی کتابیں مسلسل خریدی جاتی ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ پرانے وقتوں کی روایت کے مطابق یہاں عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کتابیں بھی موجود ہیں۔ قارئین کے ذوق کی مناسبت سے یہاں ابن صفی سے لے کر اکرم الہ آبادی تک اور دوسرے مقبول مصنفوں کے ناول بھی رکھے گئے ہیں۔ لائبریری کو دلّی کے مشہور اردو رسالوں کے ذخیرے پر ناز تھا۔ اندیشہ ہے کہ وہ پانی کی نذر ہو گیا۔ وسطی ہند کی اتنی بڑی لائبریری کو گرانٹ ملتی ہے لیکن بس آنسو پونچھنے بھر کی۔ کچھ لوگ رکنیت کے نام پر فیس ادا کرتے ہیں لیکن برائے نام۔ بھوپال کی تاریخ کے ورق کھولیں تو دل میں ہُوک سی اٹھتی ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد لکھتی ہیں کہ نواب شاہجہاں بیگم کے دور میں بھوپال میں پڑھنے لکھنے کا ذوق عام تھا۔ لوگ بڑے شوق سے تعلیم حاصل کر رہے تھے جس کے ساتھ ہی کتابیں لکھنے اور چھاپنے کا رواج عام ہوا۔ ڈاکٹر صاحبہ لکھتی ہیں کہ ریاست کی طرف سے کتابیں مفت تقسیم کی جاتی تھیں جس کی وجہ سے لوگ اپنے گھروں میں کتب خانے قائم کرنے لگے تھے۔ بھوپال کے سرکاری چھاپہ خانوں میں کوئی دو سو کتابیں سالانہ چھپتی تھیں اور مفت تقسیم ہوتی تھیں۔

جن دنوں میرا بھوپال جانا ہوا، اس دیوانِ غالب کی بڑی شہرت تھی جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ غالب کے اپنے ہاتھ کی تحریر ہے۔ وہ نسخہ کسی طرح امروہہ اور وہاں سے رام پور پہنچا، ایک دنیا اسے دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔ اس کا ایک شاندار اور مہنگا ایڈیشن چھپ رہا تھا کہ اس کا عکس کسی طرح لاہور پہنچا اور سستے داموں شائع بھی ہوا۔ آخر میں حال کھلا کہ کسی ماہر خوش نویس کا تیار کیا ہوا وہ جعلی نسخہ تھا اور غالباً بھاری معاوضے کے خیال سے ریاست بھوپال لایا گیا تھا۔ میں جو کتابوں کے پرانے ذخیروں کا حال جاننے کے خیال سے نکلا تھا، مجھے بتایا گیا کہ ریاست کے محلّات میں خدا جانے کیسی کیسی کتابیں موجود ہیں، کوئی نہیں جانتا اور وہ ثابت و سالم ہیں یا غارت ہوئیں، کسی کو خبر نہیں۔ یہ مضمون روزنامہ جنگ پر شائع ہوا

شعبہ پاکستان

بی اماں: تحریک خلافت کی سرگرم کارکن اور علی برادران کی والدہ آبادی بیگم کون تھیں؟

تحریر: عقیل عباس جعفری

وہ 27 سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں تو اُن کے کاندھوں پر چھ بیٹوں اور ایک بیٹی کی ذمہ داری تھی۔ چونکہ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں اس لیے خاندان والوں نے عقدِ ثانی کا مشورہ دیا مگر انھوں نے سختی سے مسترد کر دیا۔

اپنا زیور بیچ بیچ کر بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور قسمت دیکھیے کہ بچے بھی کون، شوکت علی اور محمد علی، جو آگے چل کر 'علی برادران' کے نام سے معروف ہوئے۔ اُن کا اصل نام آبادی بیگم اور تعلق امروہہ سے تھا۔ آبادی بیگم کے والد ملازمت کے سلسلے میں امروہے سے رامپور منتقل ہو گئے تھے۔ رامپور میں ہی آبادی بیگم کی شادی عبدالعلی خان سے ہوئی۔ شادی سے پہلے وہ پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتی تھیں لیکن شوہر پڑھے لکھے شخص تھے، ریاست رامپور میں ملازم تھے اور اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابوں کے مطالعہ کے رسیا تھے۔ انہی کی صحبت میں آبادی کو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا اور اتنی اُردو پڑھ لی کہ شوہر کی زندگی میں ہی ٹوٹی پھوٹی اُردو لکھنے اور پڑھنے لگیں۔ شوہر کی وفات کے بعد انھوں نے باقاعدہ اُردو پڑھی اور پھر جب جلسوں میں تقریر کرنے کا موقع ملا تو کوئی یقین ہی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ خاتون 18، 20 سال کی عمر تک اَن پڑھ تھیں۔ ان کے بیٹے مولانا محمد علی کہا کرتے تھے کہ میری والدہ عملی طور پر بالکل اَن پڑھ تھیں مگر مجھے زندگی میں جن لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اُن میں سے کوئی ایک شخص ایسا نہیں ملا جو ان سے زیادہ صاحبِ فہم ہو۔ محمد علی یہ بھی کہتے تھے کہ وہ جو بھی کچھ ہیں اور جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ خداوند کریم نے انھیں ان کی والدہ کے ذریعے سے پہنچایا تھا۔

آبادی بیگم نے اپنے بیٹوں شوکت علی اور محمد علی کو پہلے علی گڑھ پڑھنے کے لیے بھیجا اور اس کے بعد انگلستان، جہاں ان دونوں بھائیوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ دونوں بھائی وطن واپس لوٹے تو انھوں نے پہلے ریاستی ملازمتیں کیں مگر جلد ہی انھوں نے ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ دونوں بھائی پہلے صحافت اور پھر عملی سیاست کے میدان میں جھنڈے گاڑنے لگے۔ سنہ 1914 میں اُن بھائیوں کو انگریزوں کے خلاف اداریہ لکھنے پر گرفتار کر لیا گیا، اُس وقت آبادی بیگم کی عمر 62 برس تھی۔ آبادی بیگم نے اپنے بیٹوں کی ہمت بندھانے کے لیے خود بھی عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ اب لوگ انھیں 'بی اماں' کے نام سے یاد کرنے لگے تھے۔ سنہ 1919 میں خلافت تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ شوکت علی اور محمد علی عوام کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد پر ابھارنے کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے، اُن پر بغاوت کا الزام تھا اور ان پر مقدمہ چلانے کے لیے انھیں کراچی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں ایک صاحب دل اقبال سہارنپوری نے سولہ بند پر مشتمل 'صدائے خاتون' کے نام سے ایک نظم لکھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نظم کا ٹیپ کا مصرع 'بولی اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پر دے دو' ملک بھر میں مقبول ہوگیا۔

نظم کچھ اس طرح ہے:

بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہو تمھی میرے گھر کا اجالا، تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلیٰ، جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔۔۔

بی اماں نے اپنے بیٹوں کی قید کا زمانہ بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا، وہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں گئیں اور اپنی تقریروں سے مسلمانوں کے جذبہ حریت کو گرماتی رہیں۔ شوکت علی اور محمد علی کو قید کی سزا ہوئی تو انھی اقبال سہارنپوری نے ایک اور نظم لکھی جس کا عنوان تھا 'صدائے مظلوم' اور اس کا پہلا بند تھا۔

'کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

آبرو حق کے رستے میں دے دی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو'

یہ ایک طویل نظم تھی جو اٹھارہ بند پر مشتمل تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ دونوں نظمیں خاص طور پر 'صدائے خاتون' اس زمانے میں اتنی مقبول تھیں کہ دورافتادہ دیہاتوں کی ناخواندہ عورتوں تک، جنھیں سیاسی تو کیا سماجی شعور تک نہ تھا انھیں لکھ لکھ کر یا حفظ کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور ان کے مرد شہروں سے اپنے خطوط میں یہ نظمیں لکھ کر یا لکھوا کر انھیں بھیجا کرتے تھے۔ بی اماں جلسوں میں شرکت کرتیں، تقریریں کرتیں، ریل گاڑی کے ذریعے طویل سفر کرتیں اور اکثر بیل گاڑی کے ذریعے ریلوے سٹیشن سے جلسہ گاہ تک پہنچتیں۔ ایک دفعہ یہ خبر مشہور ہوگئی کہ مولانا محمد علی، بعض دوسرے افراد کی طرح، معافی مانگ کر جیل سے رہا ہو جائیں گے۔ بی اماں نے یہ خبر سُنی تو غضبناک ہوگئیں اور بولیں 'نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا، محمد علی اسلام کا سپوت ہے، وہ انگریزوں سے معافی مانگنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر اس نے یہ حرکت کی تو میرے بوڑھے ہاتھوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں، ایسی زندگی جس سے اسلام پر حرف آئے لعنت ہے۔' یہ زمانہ ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا۔ سنہ 1923 میں جامعہ ملیہ دہلی کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس کی صدارت حکیم اجمل خان نے کی اور بنگال کے سائنسدان سر پی سی رائے نے اسناد تقسیم کیں۔ سہ پہر کو طلباء محمد علی ہال میں جمع ہوئے، بی اماں نے بغیر برقعہ کے خطاب کیا اور کہا کہ 'میں نے اپنا برقعہ اس لیے اُتارا ہے کہ اس ملک میں اب کسی کی آبرو باقی نہیں رہی، میں نے سنہ 1857 میں اپنے جھنڈے کو لال قلعے سے اُترتے دیکھا، اب میری تمنا ہے کہ اب میں انگریزوں کے جھنڈے کو لال قلعے سے اترتے دیکھوں۔' بی اماں کے اس خطاب سے تمام طلبا میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ حالات تبدیل ہوئے، ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے اور کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی تو بی اماں کو بڑا صدمہ ہوا۔ بی اماں کے مداحوں میں گاندھی جی اور مسز اینی بیسنٹ بھی شامل تھیں۔ ان دونوں نے بی اماں کو خطوط لکھے کہ اس موقع پر آپ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ بی اماں کے کہنے پر گاندھی جی ان سے ملنے دہلی بھی آئے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر 21 دن کے برت کا اعلان بھی کیا۔ 11 مارچ 1924 کو بی اماں کو اپنی پوتی آمنہ کی موت کا صدمہ جھیلنا پڑا۔ اس کے چند ماہ بعد 12 اور 13 نومبر 1924 کی درمیانی شب بی اماں بھی وفات پا گئیں۔ انھیں دہلی میں درگاہ شاہ ابوالخیر میں سپرد خاک کیا گیا۔ بی اماں کی وفات پر ہندوستان بھر میں تعزیتی اجلاس ہوئے جس میں کیا ہندو اور کیا مسلمان سبھی نے بی اماں کی ہمت، جوش اور ولولے کو خراج تحسین پیش کیا۔ ان خراج تحسین پیش کرنے والوں میں بڑے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے عام اور گمنام لوگ بھی شامل تھے۔

تحریر: محسن نقوی

اتنی مدت بعد ملے ہو

اتنی مدت بعد ملے ہو
کن سوچوں میں گم پھرتے ہو
اتنے خائف کیوں رہتے ہو
ہر آہٹ سے ڈر جاتے ہو
تیز ہوا نے مجھ سے پوچھا
ریت پہ کیا لکھتے رہتے ہو
کاش کوئی ہم سے بھی پوچھے
رات گئے تک کیوں جاگے ہو
میں دریا سے بھی ڈرتا ہوں
تم دریا سے بھی گہرے ہو
کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو
پیچھے مڑ کر کیوں دیکھا تھا
پتھر بن کر کیا تکتے ہو
جاؤ جیت کا جشن مناؤ
میں جھوٹا ہوں تم سچے ہو
اپنے شہر کے سب لوگوں سے
میری خاطر کیوں الجھے ہو
کہنے کو رہتے ہو دل میں
پھر بھی کتنے دور کھڑے ہو
رات ہمیں کچھ یاد نہیں تھا
رات بہت ہی یاد آئے ہو
ہم سے نہ پوچھو ہجر کے قصے
اپنی کہو اب تم کیسے ہو
محسنؔ تم بدنام بہت ہو
جیسے ہو پھر بھی اچھے ہو

قومی المیہ تعلیم حاصل کرنا یا جانور چرانا

تحریر: ابن قدسی

روزنامہ جنگ 17 نومبر 2020 کو ایک خبر پڑھی۔ خبر کیا تھی؟

ایک قومی المیہ تھا۔ افسوس اور دکھ کا ناہنجار سمندر۔ شاید اس میں ڈوب کر جگر چھلنی ہوجاتا۔ بے بسی اور لاچاری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خبر تھی کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والی خاتون ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ڈاکٹر ساجدہ احمد کے ایک کھلے خط کی جو انہوں نے چیف جسٹس پاکستان اور چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے نام لکھا۔ خط کیا ہے۔ ایک مکمل چارج شیٹ ہے۔ مایوسی اور ناامیدی کے بعد آخری امید نظام عدل ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا مداوا کرنے کے لیے اسی کے پاس جایا جاتا ہے۔ چاہے جو مرضی ہوجائے۔ ایک حوصلہ رہتا ہے کہ نظام عدل کے پاس جائیں گے تو انصاف ملے گا۔ حق تلفی نہیں ہوگی۔ لیکن اس کھلے خط نے تو کھلی کھلی مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر کسی اور کی تحریر ہوتی تو شاید اتنی توجہ نہ کھینچتی لیکن یہ تحریر تھی ایک ایسے فرد کی جو سالہا سال قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو انصاف مہیا کرنے کے منصب پر بیٹھا ہے۔ اس کی تحریر معمولی تحریر نہیں یا اسے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ جذباتی تحریر ہے۔ ایسا کہنے سے اس منصب کی توہین ہے جس پر وہ بیٹھی ہیں۔ مگر تحریر میں بیان کردہ حقائق تو دل دہلا دینے والے ہیں۔ معاشرہ کا ایک مکروہ چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ جہالت کی پزیرائی اور علم وحکمت کی رسوائی معاشرے میں راسخ ہوجائے تو تہذیب ختم ہوجاتی ہے۔ جانوروں کی بھی شاید کوئی اقدار ہونگی لیکن عقل و دانش اور علم وحکمت کے بغیر انسانی معاشرہ جنگل سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ اس کھلے خط کے مندرجات پڑھتے جائیں اور سوچیں یہ کس قسم کے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ جج صاحبہ لکھتیں ہیں کہ "عدلیہ کا حصہ بننے کی بجائے بہتر یہ ہوتا کہ وہ اپنے گاؤں میں چوپایہ پالتیں اور اپلے تھوپتیں، کیونکہ عدلیہ کا حصہ بننے کی وجہ سے انہیں "نام نہاد" وکلاء کی گندی گالیاں اور توہین برداشت کرنا پڑتی ہے۔"

پھر کہا کہ "اگر اسلام میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو وہ خودکو سپریم کورٹ کی عمارت کے سامنے خودکشی کرلیتیں کیونکہ جج کی حیثیت سے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو روزانہ کی بنیاد پر گالیوں، توہین اور ہراسگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

جہالت کے بالمقابل اعلیٰ تعلیم کی بے حرمتی ملاحظہ کریں۔ "اگر مجھے عدالت میں خاتون جج کی حیثیت سے نام نہاد وکلاء سے توہین اور گندی گالیاں برداشت کرنا ہیں تو میرے لیے بہتر تھا کہ میں اپنی زندگی کے پچیس سال اعلیٰ تعلیم کے حصول میں لگانے کی بجائے عام پاکستانی لڑکیوں کی طرح بیس سال کی دہائی میں شادی کر لیتی اور اپنے والدین کا قیمتی وقت اور پیسہ پندرہ سال تک اسلام آباد میں اعلیٰ تعلیم کے حصول پر برباد نہ کرتی۔ اچھا ہوتا کہ میں چوپایے کو چرانے کا کام کرتی، اپلے تھوپتی، اپنی کاشتکار فیملی کی مدد کرتی اور اسلام آباد کی روشنیوں کی بجائے پریشانیوں اور مصائب سے پاک زندگی گزارتی۔"

ناانصافی کی داستان کچھ اس طرح ہے کہ "اس عظیم پیشے کو غیر پیشہ ور افراد اور کالی بھیڑوں نے ہائی جیک کرلیا ہے۔ وکلاء کے عدالتوں اور پریزائڈنگ افسر کی موجودگی میں عام عوام، پولیس پر زبانی وجسمانی حملے معمول بن چکے ہیں، یہ سب کچھ آپ کی ناک کے نیچے ہورہا ہے۔"

مایوسی اور پریشانی تعلیم کی اہمیت کھو دیتی ہے۔ کہتی ہیں کہ "میں مجبور ہوں مایوس اور

پریشان بھی کہ اپنی تعلیمی اسناد ایک ایک کر کے عزت مآب لاہور ہائی کورٹ کے سامنے نذر آتش کر دوں یا پھر احتجاجاً سپریم کورٹ کے سامنے تاکہ 23 کروڑ عوام میں خواتین کو اتنا حوصلہ ملے کہ وہ آئیں اپنے جوش اور ایمان کے ساتھ کسی کی بہن، بیٹی یا بیوی یا ماں بن کر اپنے وقار اور تکریم کے ساتھ اس عظیم قوم کی خدمت اس پیشے میں رہتے ہوئے کر سکیں جس کی اب قدر نہیں رہی۔"

جس ملک میں انصاف مہیا کرنے والے ادارہ کا یہ حال ہے تو باقی شعبہ جات کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر وہاں منبر رسول پر بیٹھ کر دین کے علمبردار گالیاں نکالتے ہیں تو صرف ان کو کیسے قصوروار کہا جاسکتا ہے۔ جہاں بدزبانی کو علمیت اور بدعنوانی کو تہذیب سمجھا جائے تو وہاں کسی اچھائی کی کیا امید رکھی جاسکتی ہے۔ صرف نعرہ لگانا ہے پھر جنازے اٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جہاں اپنی کم علمی کی وجہ سے گارڈ بننے والا شخص اپنے بنک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے مینیجر کو نعرہ لگا کر مار دیتا ہے اور ہیرہ بن جاتا ہے وہاں علم اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ شعور زمین کی اتاہ گہرائیوں میں دفن ہو جاتا ہے۔ ہزاروں افراد ایک ایسے شخص کا جنازہ پڑھنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں جو نعرہ تو ناموس رسالت کا لگاتا رہا لیکن کسی کی ناموس کا اسے خیال نہیں تھا۔ اس کا رویہ اس طرح کا تھا کہ دنیا میں صرف اسے ناموس رسالت عزیز ہے باقی دنیا میں سارے گستاخ رسول پائے جاتے ہیں۔ جس نے منبر رسول کی توہین کی۔ داڑھی اور پگڑی کی ناموس کو خاک میں ملا دیا لیکن نعرہ ناموس رسالت کا تھا اور نعرہ معتبر تھا اس لیے کسی اور چیز پر غور نہیں کیا گیا۔ جس طرح کا معاشرہ بن گیا ہے اس سے اسی رویہ کی توقع تھی۔ ہزاروں کے مجمع نے معاشرے کی مجموعی سوچ کی عکاسی کر دی۔ اس معاشرہ کو علم و حکمت اور دانش مندی سے کوئی سروکار نہیں۔ کھوکھلے نعرہ لگاؤ اور مال کماؤ۔ خواہ ڈاکٹر مارو یا جج بس نعرے لگنے چاہیے۔ انسانیت کی اس قدر تذلیل کی گئی کہ کسی کی جان لینا معمولی کام بن گیا ہے۔ کسی کے دروازے پر دستک دو۔ اندر سے جو بھی نکلے اس پر گولی چلا دو۔ چلانے والا پندرہ سولہ کا نوجوان۔ جسے علم و شعور کی مکمل آگاہی بھی نہیں لیکن جس پر گولی چلائی اس نے محنت کر کے روپیہ پیسا لگا کر انسانیت کی خدمت کرنے والا ڈاکٹر جیسا معزز پیشہ اپنایا ہوا تھا۔ اس گولی نے ثابت کر دیا کہ ہمیں جسمانی علاج کی نہیں بلکہ ذہنی علاج کی ضرورت ہے۔ ہمیں علم حاصل کرنے والے نہیں چاہیے بلکہ جانور چرانے والے چاہیے۔

❁❁❁

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدر دانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

Lahore International Magazine

Instagram: @lahoreintl
Twitter: @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

پاکستان کو خونی انقلاب کی نہیں تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے

تحریر: عثمان عابد

حال ہی میں United Nations نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔جس کے مطابق پاکستان تعلیم کے میدان میں دنیا سے 50 سال پیچھے ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس رپورٹ کے منظر عام پر آتے ہی پورے ملک میں کھلبلی مچ جاتی۔سوشل میڈیا میں اس رپورٹ پر گرما گرم بحث ہوتی۔الیکٹرونک میڈیا اس خبر کو Breaking News کے طور پر عوام کے سامنے لاتا۔تعلیمی ایمرجنسی کی بات ہوتی۔ سیاست کے ایوانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی۔غرض جس طرح بھارت کی نام نہاد Surgical Strikes پر ہمارا جذبہ حب الوطنی قابل دید تھا۔۔کاش United Nations کی اس رپورٹ پر بھی ہم اسی جوش وجذبے کا اظہار کرتے۔لیکن من حیث القوم ہم خواب غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں۔ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ہمارا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟ کیا دہشت گردی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے؟ کیا توانائی کے بحران پر قابو پا کر ہمارا ملک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہو جائے گا؟ کیا بے روزگاری، معاشی مسائل اور کرپشن پر قابو پا کر ہم سپر پاور بن جائیں گے؟ نہیں! بالکل نہیں! بلکہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہاں کا زنگ آلود اور فرسودہ تعلیمی نظام ہے۔جس دن ہم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ پاکستان کا بنیادی مسئلہ دہشت گردی، توانائی کا بحران، بے روزگاری، کرپشن یا معاشی مصائب کی بجائے یہاں کا فرسودہ اور زنگ آلود تعلیمی نظام ہے اُسی دن سے پاکستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گا۔

پاکستان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کی ترجیحی فہرست میں تعلیم کا نمبر سب سے آخر میں آتا ہے۔اگر دوسرے ممالک سے موازنہ کیا جائے تو پاکستان اپنے GDP کا محض 2% تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔ ہمارے ہمسائیہ ملک افغانستان میں اگرچہ جنگ کی کیفیت ہے لیکن وہ بھی ہم سے دوگنا زیادہ یعنی اپنے GDP کا 4% تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔ ہندوستان سے موازنہ کریں تو وہ اپنے GDP کا 7% تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔

کاش کوئی ان حکمرانوں کو جا کر بتائے کہ اُجالا سکیم لانچ کرنے سے، طلباء میں سولر لائٹس تقسیم کرنے سے، نوجوانوں پر لیپ ٹاپ نچھاور کرنے سے، طلباء کو قرض دینے سے یا اسکولوں اور کالجوں میں داخلے کی شرح بڑھانے سے اگر ہمارا تعلیمی نظام ٹھیک ہو سکتا تو تین دہائیاں پہلے ہی ٹھیک ہو چکا ہوتا۔آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام ابھی تک فرسودہ اور زنگ آلود ہے؟ آخر کیوں ہماری ڈگریوں کو دوسرے ممالک میں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے؟ دنیا کی پہلی سو یونیورسٹیز میں ہماری ایک بھی یونیورسٹی شامل نہیں۔ ایسا کیوں؟ ہمارا تعلیمی نظام ہمارے اندر مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے سے کیوں قاصر ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب تلاش کرنے کیلئے ہمیں تعلیمی نظام کی تباہی کی اصل وجہ یعنی جڑ تلاش کرنا ہوگی۔ ہمارے تعلیمی نظام کی تباہی کی اصل جڑ Memory Based Education یعنی رَٹا کلچر ہے۔جب تک ہم رَٹا کلچر کو ختم نہیں کریں گے ہم کبھی بھی اپنا تعلیمی نظام درست نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم اپنے تعلیمی نظام کو رَٹا کلچر کی زنجیروں میں جکڑے رکھیں گے۔۔ترقی کا خواب ہمیشہ خواب ہی رہے گا۔ ہمارا تعلیمی نظام ایک ایسی بنجر زمین کی مانند ہے کہ جس پر جہالت کی خاردار جھاڑیاں تو اُگ سکتی ہیں لیکن یہ زمین تخلیقیت (Creativity) کی فصل اُگانے سے قاصر ہے۔ہمیں ایک ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے کہ جس میں طلباء کی Grading اس بنیاد پر نہ ہو کہ انھوں نے کتنا زبانی یاد کیا ہے۔ یا رَٹا لگایا ہے بلکہ اس بنیاد پر ہو کہ ان کے اندر مسئلے کو حل کرنے کی کتنی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔علم اُسی وقت قابل استعمال ہوتا ہے جب وہ ہمارے Mental Tool Box کا حصہ ہو نہ کہ محض زبانی یاد ہو۔اگر ہم اسی نقطے پر ہی عمل کر لیں تو اس سے یقیناً ہمارے تعلیمی نظام میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ایک سے زیادہ تعلیمی نظام، تعلیم کیلئے کم بجٹ، Memory Based Educations، ناقص اور بے سمت تعلیمی پالیسیز، کوالٹی ٹیچنگ کا فقدان، ناقص ریسرچ اور سیاستدانوں کی عدم دلچسپی وہ چند بڑی وجوہات ہیں کہ جنہوں نے ہمارے تعلیمی نظام کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

مسائل کی نشاندہی کے بعد اب آتے ہیں ان کے حل کی جانب۔حکمرانوں اور تعلیمی پالیسی وضع کرنے والوں سے التماس ہے کہ وہ ایک طویل مدتی National Education Policy مرتب کریں کہ جس کا مقصد محض دکھاوا یا عوام کو بیوقوف بنانا نہ ہو بلکہ وہ زمینی حقائق کے مطابق لاگو بھی کی جاسکے۔ زمینی حقائق کے مطابق شاید فی الحال پورے ملک میں یکساں تعلیمی نظام رائج کرنا شاید ممکن نہ ہو البتہ یکساں تعلیمی نصاب ضرور متعارف کروایا جا سکتا ہے۔ اس سے دیہاتی اور شہری دونوں قسم کے طلبا کو آگے بڑھنے کا برابر موقع میسر ہوگا۔ یکساں تعلیمی نصاب سے ملک میں یکجہتی، امن اور محبت کو فروغ ملے گا اور انشاء اللہ پاکستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوگا۔اسی طرح امتحانی نظام کو یکسر تبدیل کر کے ایک ایسا نظام وضع کرنا ہوگا کہ جس سے طلباء کی یاداشت جانچنے کی بجائے یہ جانچا جائے کہ آیا ان کے اندر مسائل کو حل کرنے کی کتنی صلاحیت پیدا ہوئی ہے۔ سکول و کالج کی سطح پر Career Counseling Center بنائے جائیں تاکہ طلبا اپنے رجحانات اور مارکیٹ میں موجود مواقعوں کو سمجھ سکیں اور ایک درست سمت میں آگے بڑھ سکیں۔ بچوں کے ساتھ ساتھ والدین کی کاؤنسلنگ بھی بہت ضروری ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کو ان کے رجحانات اور سکلز کے مطابق کیریئر کے انتخاب میں معاونت کر سکیں۔ نیز تعلیمی نظام میں اصلاحات صرف گورنمنٹ اکیلی نہیں کر سکتی بلکہ پبلک اور پرائیویٹ اداروں کے ساتھ ساتھ ہم سب کو مل کر اپنی حیثیت کے مطابق ذمہ داری لینا ہوگی اور ملک کی اکثریت آبادی کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا ہوگا۔اللہ مجھے اور آپ کو دوسروں کی زندگی میں آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کفر کے فتوے اور قتل کی وارداتیں

تحریر: محمد عمران چوہدری

''ہمارے جنازے یہ ثابت کریں گے کہ ہم عاشق رسولؐ تھے یا گستاخ رسول تھے''۔ یہ الفاظ درد میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ (مرحوم) حاجی عبدالوہاب صاحب کی زبان سے اس وقت نکلے جب رائیونڈ میں کارگزاری کے عمل کے دوران ایک جماعت نے یہ بتایا کہ ایک علاقے میں ان کو نہ صرف مارا گیا بلکہ گستاخ رسول کہہ کر انہیں مسجد سے بھی نکال دیا گیا۔

یہ واقعہ گزشتہ روز ضلع سرگودھا میں بینک منیجر کو گارڈ کی جانب سے توہین رسالت کے الزام میں مارے جانے پر یاد آ گیا۔ میں نے جب تفصیلات معلوم کیں تو علم ہوا کہ مظلوم نے چند روز قبل ظالم کو نوکری سے فارغ کروا دیا تھا۔ گارڈ جمہوریت کے فیوض و برکات سے بحال تو ہو گیا، مگر پھر اس نے اپنے ہی سربراہ پر توہین رسالت کا الزام لگا کر خود ہی عدالت لگائی، اور پھر خود ہی جج بن کر فیصلہ سنا دیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اس طرح کے واقعات اب عام ہوتے جا رہے ہیں۔

گزشتہ سال چنیوٹ کے ایک نواحی گاؤں میں امام مسجد نے ایک جنازہ یہ کہہ کر پڑھانے سے انکار کر دیا تھا کہ مرحوم کا تعلق کافر گروپ سے ہے۔ بعد ازاں دوسرے امام کے پڑھانے پر وہ ایک فتویٰ بھی لے آئے کہ جو جنازہ پڑھے گا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ جس سے آدھے گاؤں کے افراد اپنی بیویوں سے محروم ہو گئے تھے۔

برطانوی نشریاتی ادارے نے جب متعلقہ ڈی پی او کے علم یہ بات لائی تو انہوں نے یہ کہہ کر کیس نمٹا دیا کہ اگر چند افراد دوبارہ نکاح پڑھا لیں گے تو اس میں کیا حرج ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سے پہلے پانی سر سے گزر جائے، ہر کوئی اپنی عدالت لگا لے، ہر کوئی مفتی بن جائے، یا پھر کوئی سرپھرا، کوئی لالچی شخص اپنے دنیاوی مفادات کے لیے کسی پر توہین رسالت کا الزام لگا دے، ریاست کو جاگ کر اپنی ذمے داری کا احساس کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم متحدہ عرب امارات کی پیروی کر سکتے ہیں۔ آیئے آپ کو بتاتے ہیں کہ امارات میں کیا ہوتا ہے۔ متحدہ عرب امارات میں ایک سرکاری فتویٰ سینٹر موجود ہے، جہاں پر مفتی صاحبان عربی، انگلش اور اردو زبان میں آپ کی مدد کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ آپ امارات میں کہیں پر موجود ہیں، آپ کو کوئی بھی مسئلہ معلوم کرنا ہے تو آپ سینٹر کے ٹیلیفون نمبر پر مفت کال کر کے اس بابت آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ رابطے کا نمبر ہر مسجد میں اوقاف کی جانب سے آویزاں کیے گئے اذکار کے چارٹ پر بھی موجود ہوتا ہے۔ سرکاری فتویٰ سینٹر کے علاوہ کسی سے بھی دین کی بات معلوم کرنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔

اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی سرکاری سطح پر ایک فتویٰ سینٹر قائم کر دیا جائے۔ ہمارے ہاں چونکہ کئی ایک مسالک موجود ہیں تو ہر مسلک سے ایک جید اور مستند عالم کا انتخاب کر کے عوام کو پابند کر دیا جائے کہ جس کو دین کی کوئی بھی بات معلوم کرنی ہو تو وہ صرف اور صرف سرکاری فتویٰ سینٹر سے معلوم کرے۔ مذہبی تقریبات کو مسجد کی چار دیواری تک محدود کر دیا جائے۔ اور آخر میں عوام سے بھی گزارش ہے کہ مذہب آپ کا ذاتی معاملہ ہے، اس لیے آپ اس کو اپنی ذات تک محدود رکھیے۔ اگر آپ سے کوئی دین کی کوئی بات معلوم کرنے کی کوشش کرے تو اس کو سرکاری فتویٰ سینٹر اور جب تک سرکاری طور پر یہ کام نہ ہو اس وقت تک کسی مستند عالم دین کی راہ دکھائی جائے۔ ہم سب عہد کر لیں کہ ہم کسی مذہبی معاملے پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کریں گے۔ اور ایک آخری بات، یاد رکھیے اگر آپ نے کسی کو درست دینی معلومات دیں تو یہ صدقہ جاریہ بن جائے گی، اور اگر وہ غلط ہوئی تو نہ صرف گناہ جاریہ بن جائے گی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ پر توہین رسالت کا الزام بھی لگ جائے اور اور......

اپنے اپنے قد کے برابر کا اقبال

تحریر: عطاء الحق قاسمی

میں جب اقبال کو پڑھتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ خدا نے یہ کنول کا پھول کن پانیوں میں اگا یا؟ گزشتہ رات کلیات اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے میں ایک دفعہ پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اقبال اپنی قوم کو پستیوں سے کھینچ کر اپنی سطح پر لانا چاہتا ہے لیکن قعر مذلت میں گرے ہوئے قوم کے سبھی طبقے اسے کھینچ کھانچ کر اپنے برابر کھڑا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ہم کلیاتِ اقبال میں سے اپنے سائز کا اقبال تلاش کرتے ہیں اور پھر اسے محفلوں میں لئے پھرتے ہیں۔ اقبال وہ جن ہے جس کا قد آسمان سے باتیں کر رہا ہے اور جس کے بازو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھ کر ہمیں اپنی کوتاہ دامنی کا احساس ہونے لگتا ہے چنانچہ ہم جنتر منتر پڑھ کر اس جن کو مکھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح پرانی داستانوں میں کوئی مکروہ جادوگر کسی خوبصورت شہزادے کو مکھی بنا کر بوتل میں قید کر دیتا ہے۔ اقبال ممولے کو شہباز سے لڑانا چاہتا ہے، اقبال ذہنوں کو کشادہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ دماغ کو کام کرنے کی اجازت دی جائے لیکن ہم شاہ دولے کے چوہے بنے رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اقبال کو کٹھ ملائیت سے چڑ کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال نہیں کرتے بلکہ دلیل کے طور پر اپنے سے بھی گئے گزرے کسی ''عالم'' کی سند تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں اور یوں اس کا ذہن کشادہ نہیں ہو پاتا:

فقیہ شہر کی تحقیر کیا مجال میری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

پرانا لطیفہ ہے کہ ایک سردار جی چھپڑ میں ہاتھ ڈال کر اپنی گری ہوئی چونی تلاش کر رہے تھے اور ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ یا اللہ میری چونی مل جائے۔ ایک دوسرے سردار کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے موصوف کو ڈانٹتے ہوئے کہا، یہ تم نے کیا یا اللہ لگائی ہوئی ہے، واہ گرو سے مدد کیوں نہیں مانگتے؟ اس پر سردار جی نے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا، میں ایک چونی کی خاطر اپنے واہ گرو کا ہاتھ چھپڑ میں ڈلوانا نہیں چاہتا مگر ہمارے مذہبی پیشوا چونی سے بھی کم تر مقاصد کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام استعمال کرتے ہیں جس کے ہولناک نتائج آج سامنے آ رہے ہیں۔ کورونا کی آمد سے پیشتر میں بیرون ملک گیا، اُس وقت ہمارے ہاں حسب معمول سیاسی سرگرمیاں جوبن پر تھیں ٹی وی چینلز حسب ضرورت لائیو کوریج کرتے تھے چنانچہ بیرون ملک مقیم پاکستانی مجھ سے ملتے تو یہی سوال کرتے کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟ پہلے تو میں حسبِ توفیق انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا حتیٰ کہ بار بار کئے جانے والے اس سوال سے زچ ہو کر ایک دن میں نے ایک دوست کے اس سوال کے جواب میں کہا کہ جب دوسری جنگ عظیم نے طول پکڑا اور لوگوں کی پریشانی اپنے عروج پر پہنچ گئی تو چرچل کے ایک قریبی دوست نے چرچل سے ملاقات کا سوچا تا کہ وہ براہ راست اس سے پوچھے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی کیونکہ لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے؟ وہ تین دفعہ چرچل کی طرف گیا مگر چرچل کے مسلسل میٹنگوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی تاہم ایک روز بالآخر وہ ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا، یہ شخص چرچل کے آفس میں داخل ہوا تو اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس وقت اس کا دوست ریلیکسنگ موڈ میں ہے، چرچل نے خوشدلی سے اپنے دوست کو ویلکم کیا۔ سگار سلگایا اور اپنے دوست کے سوال سے پہلے ایک کش لیکر اس سے پوچھا، یار یہ جنگ کب ختم ہوگی؟ مجھے لگتا ہے کہ چرچل کی طرح ہمارے رہنماؤں کے سامنے بھی مستقبل کا نقشہ واضح نہیں ہے کہ آخر وہ بھی تو ہم ہی میں سے ہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میں بار بار گھوم پھر کر ایک ہی نکتے پر آ جاتا ہوں مگر اقبال بھی تو دل کی کشادہ والی بات بار بار کرتا ہے۔ یہ دلوں کی گھٹن ہی کا نتیجہ ہے کہ قوم کے سبھی طبقوں میں عدم برداشت کا زہر پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے پاکستان کا ابتدائی دور دیکھا ہے، اُن دنوں لوگوں میں برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا، کیا آج کے دور میں اُس رویے کی توقع کی جا سکتی ہے؟ خدا کے لئے ایک دوسرے کو برداشت کریں جن خیالات کو آپ پسند نہیں کرتے، اس کے جواب میں اختلاف کرنے والے کے سر پہ اینٹ نہ ماریں، اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی نہ کریں بلکہ دلیل کا جواب دلیل سے دیں کہ اس وقت ملک کی ترقی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ اختلافِ رائے کو برداشت کرنا بھی ہے۔ چنانچہ عسکری تنظیموں کا وجود میں آنا اور یوں اس کا نتیجہ عوام کے سکون اور ملکی معیشت کی بربادی کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ کالم کی سنجیدگی کم کرنے کے لئے ایک لطیفہ سن لیں۔ یہودیوں نے تو آہ و زاری اور اپنے گناہوں کی معافی کیلئے دیوارِ گریہ بنائی ہوئی ہے۔ ہم نے بھی آہ و زاری کے لئے اپنی اپنی دیوار گریہ منتخب کر رکھی ہے جہاں جا کر ہم روتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں کچھ کی دیوارِ گریہ واشنگٹن ہے، کسی کی کوئی عرب یا ہمسایہ ملک اور کسی کی دیوارِ گریہ پنڈی ہے جہاں یہ لوگ جاتے ہیں، گڑگڑا کر روتے اور اپنے ''گناہوں'' کی معافی مانگتے ہیں، اگر وہاں سے معافی مل جائے تو سارے دلدر دور ہو جاتے ہیں ورنہ پھانسی بھی ہے، جلاوطنی بھی ہے ہم لوگ کیوں اپنی مدد آپ نہیں کرتے؟ ہم ملکی ترقی کے لئے اپنے دونوں ہاتھ استعمال کیوں نہیں کرتے۔ ایک ہاتھ آپ کا ہو اور ایک ہاتھ آپ سے اختلاف کرنے والے کا اور یہ دونوں اگر مل جائیں تو پھر ہمیں کسی دیوار گریہ کی ضرورت نہیں رہتی لیکن کبھی ایک ہاتھ کھجلانے کے کام میں مشغول ہوتا ہے اور کبھی دوسرا ہاتھ اور یوں ہماری قوم ایک عرصے سے صرف ایک ہاتھ سے کام لے رہی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی اقبال ہمیں شاہین دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں ''مُنڈا'' کہلانے کا شوق کیوں ہے؟

شعبہ پاکستان

مسلمانوں کا بہت کچھ یا شاید سب کچھ چھن گیا ہے

تحریر: اسد مفتی

کہتے ہیں جب ہلاکو خان بغداد کی اینٹ بجانے کے لیے منزلیں مارتا چلا آرہا تھا تو دینِ اسلام کے کبیر وصغیر مذہبی علماء، مفتیان کرام اور ملت اسلامیہ کے راہنما اس سوال پر دست وگریبان تھے کہ دورانِ نماز" آمین" اونچے سُروں میں کہنی چاہیے کہ دبی زبان سے؟

ایک مکتبہ فکر اس عالمِ سوچ میں غلطاں تھا، کہ احرام کی حالت میں جوں یا مچھر مارنا جائز ہے کہ نہیں؟

اگر جائز نہیں ہے تو کیسے بچا جائے؟ اور اگر ارتکاب کرے تو اس پر کیا واجب ہوگا،؟

دوسرا مکتبہ فکر اس بحث ومباحثہ میں مشغول تھا کہ وضو کرتے ہوئے دائیں پاؤں پر زور دینا چاہیے کہ بائیں پر؟

تیسرا اس بات پر عقل کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ سوئی کے ناکے سے فرشتہ گزر سکتا ہے کہ نہیں؟

چوتھا اس مباحثہ میں دور کی کوڑی لا رہا تھا کہ جس وضو میں مسواک کی جائے اس سے پڑھی جانے والی نماز کا ثواب بغیر مسواک کیے ہوئے وضو کی نماز سے 70 درجہ زیادہ ہوتا ہے؟ یا 50 درجہ؟۔۔۔۔

اسی طرح دوسرے کئی فرقے اس بحث میں مصروف تھے کہ حضرت امام حسین جب کربلا میں آئے تو انہوں نے سبز کپڑے پہن رکھے تھے یا سیاہ؟ اور یہ کہ قبلہ کی طرف رُخ کرکے وضو کرنا واجب ہے کہ مستحب؟

یہ واقعات مجھے آج اس لیے یاد آئے کہ سعودی عرب کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ وہاں ستر علما بشمول امام کعبۃ اللہ نے ٹیلی فون پر ہیلو کہنے کو حرام قرار دیا ہے۔انہوں نے فتویٰ دیا ہے انگریزی زبان میں" ہیلو" جہنم کو کہتے ہیں۔اور ہیلو کے معنی جہنمی یا دوزخی بنتا ہے۔اس سروے اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اگر "انگریز" جب خود فون کرتے ہیں یا وصول کرتے ہیں تو وہ ہائے "hi,ya" استعمال کرتے ہیں، اس طرح مسلمانوں میں بھی ہیلو ہائے کا رواج پڑ گیا ہے، وہ بھی کافروں کی نقل میں یہی کچھ کہتے ہیں۔امام کعبہ اور ستر علماء نے ہیلو کہنے سے مسلمانوں کو سختی سے منع کیا ہے۔اُدھر پاکستان میں جامعہ نعیمیہ کے ترجمان محمد ضیاء الحق نقشبندی کے مطابق" دارالافتاء جامعہ گڑھی شاہو" لاہور کے جید عالم دین علامہ مفتی محمد عمران حنفی قادری (جو اتفاق سے امام کعبہ نہیں ہیں) نے موبائل، ٹیلی فون، یا کسی کو مخاطب کرنے یا متوجہ کرنے کے لیے" ہیلو" کہنا جائز قرار دیا ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ لغت کے مطابق دوسرے کو متوجہ کرنے، پکارنے، اور خوش آمدید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کہ اس لفظ کی وضع ہی دوسرے کو متوجہ کرنے، بلانے اور سلام کرنے کے لیے ہوتی ہے، اور ہیلو کے استعمال کو حرام کہنے کا فتویٰ تحقیقی اعتبار سے شرعاً درست نہیں۔۔لفظ" ہیلو" یہود و نصاریٰ سے ہماری طرف آیا ہے، اور یہ دونوں مذہب جنت وجہنم پر ایمان رکھتے ہیں۔اور یہ کیسے ہوسکتا ہے۔کہ وہ (یہود وعیسائی) ایک دوسرے کو جہنمی یا دوزخی کہہ کر مخاطب کریں،؟

مفتی محمد عمران حنفی نے کہا ہے کہ تمام مسلمان" ہیلو" کا استعمال کرسکتے ہیں۔اس کے کہنے پر کوئی شرعی ممانعت نہیں۔بات یہیں تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا۔لیکن اُدھر ملائشیا سے بھی خبر آئی ہے کہ غیر مسلموں سے کہا گیا ہے ک وہ 35 اسلامی اصطلاحوں اور لفظوں کے استعمال سے گریز کریں، سلانگر کی ریاست کی انتظامیہ نے کافروں سے کہا ہے کہ وہ ان 35 لفظوں کو حوالے کے طور پر بھی استعمال نہ کریں۔جن اسلامی ناموں، لفظوں اور اصطلاحوں پر پابندی عائد کی گئی ہے ان میں لفظ "اللہ" بھی شامل ہے۔

غیر مسلموں اور کافروں سے کہا گیا ہے کہ اس پابندی کی خلاف ورزی پر سلانگر ریاست شرعی فوجداری ترمیمی قانون 1995 کے تحت 30000 رنگٹ (ملائشین سکہ) جرمانہ عائد کیا جائے گا۔جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں دو سال قید یا دونوں سزائیں (اللہ کا نام لینے پر) ایک ساتھ دی جاسکتی ہیں۔آپ کی معلومات اور دلچسپی کے لیے یہ بھی بتاتا چلوں کہ جن اسلامی ناموں اور اصطلاحوں کے غیر مسلموں اور کافروں کی جانب سے استعمال پر امتناع عائد کیا گیا ہے۔ان میں حسبِ ذیل نام بھی شامل ہیں۔اللہ، الٰہی، فرمان، رسول، صلوٰۃ، مبلغ، مفتی، امام، قبلہ کعبہ، حاجی وغیرہ۔۔ملائشیا کی وزارت داخلہ نے وضاحت

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED
CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address
Private UK Pension Tracing
Personal Income Tax Return investigations
Assets Review for Inheritance Tax
Rental Income Tax Returns
Appealing - Past years HMRC Penalties
UK State Pension Entitlement Review
Preparation / Filing of prior year tax returns
Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
Duplicate - Payslips / P60s
UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

جاری کی ہے کہ ملائشیا میں صرف مسلمان ہی لفظ "اللہ" استعمال کر سکتے ہیں۔۔ جبکہ میرے حساب سے مقدس لفظ "اللہ' ساری دنیا کو متحد کرنے والا ایک لفظ ہے، لیکن یہی لفظ بعض علما کی نظر میں اسلام کی جاگیر ہے، اور کسی دوسرے مذہب کے پیروکاروں کا اس لفظ پر کوئی حق نہیں ہے۔ ملائشیا میں اسلام ایک غالب مذہب ہے اور شاید اسی لیے چند مذہبی راہنماؤں نے اپنی تنگ نظری کے باعث لفظ اللہ پر اعتراض کیا کہ یہ لفظ صرف مسلمان ہی استعمال کر سکتے ہیں، جبکہ ملائشیا ہی کے ایک ماہر تعلیم مسلم عالم ڈاکٹر چندر مظفر کا کہنا ہے کہ لفظ اللہ کے استعمال سے روکا نہیں جا سکتا، انہوں نے بتایا کہ سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں 28 مرتبہ لفظ اللہ استعمال کیا گیا ہے، اس کے خلاف کسی مسلمان نے کبھی کوئی احتجاج نہیں کیا۔ میرے حساب سے ملت اسلامیہ، اُمہ، یا مسلمان یا جیسا بھی آپ کہہ لیں، ایک ایسا مریض ہے جو عطائیوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے، ہر نیم حکیم اپنے الٹے سیدھے نسخے مریض پر آزما رہا ہے۔ اور اس بات پر مُصر ہے کہ خلفاء راشدین اسی کے مطب سے دوا لیتے تھے، اور اسی کے نسخے سے مریض کو شِفا نصیب ہوگی، جبکہ اس مریض کا حال یہ ہے کہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آج اس مریض ملتِ اسلامیہ کے دینی، سماجی، اخلاقی، ثقافتی، روحانی، لسانی اور سیاسی امراض اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اس ملت کو بلاخوف وتردید جاں بلب مریض سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، اور اس کا ثبوت میں اس بات سے بھی دوں گا کہ پاکستان کے معروف عالمِ دین ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے اپنی تحریر، عالمِ اسلام کی اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال، میں انکشاف کیا ہے کہ مسلمان عورت کا گاڑی چلانا یہودیوں کی سازش ہے۔

میں نے کہیں پڑھا ہے کہ دبے، کچلے اور ستائے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف کبھی متحد نہیں ہو پاتے۔۔۔ اور ان کا حد درجہ شاطر اور چالاک دشمن ان کی صفوں میں انتشار پیدا کر کے انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آگے جبینِ شوق تجھے اختیار ہے
یہ دِیر ہے، یہ کعبہ ہے، یہ کوئے یار ہے!

لفافہ مولویوں کا بورڈ بننے کی خواہش اور نواز شریف امیر المومنین

شعبہ پاکستان

تحریر: انعام ملک

1990 میں نواز شریف پہلی مرتبہ وزیر اعظم بنا اور اس کیلئے وہ اسلامی جمہوری اتحاد کی بیساکھیوں کے سہارے اقتدار میں آیا۔ ویسے تو آئی جے آئی میں 9 جماعتیں شامل تھیں اور ان میں اکثریت مذہبی جماعتوں پر مشتمل تھی لیکن ان میں قابل ذکر جماعت اسلامی، جمیعت العلمائے اسلام (س) اور مرکزی جمیعت اہلحدیث ہی تھیں۔ جے یو آئی (س) کی قیادت دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے لیڈر مولانا سمیع الحق دیوبندی کے پاس تھی جو اپنی مذہبی سوچ کے حوالے سے بہت کٹر مشہور ہیں۔ یہ وہی مولانا سمیع الحق ہیں جن کے مدارس سے 1995 میں افغان طالبان تعلیم حاصل کر کے نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان پر قبضہ کرلیا۔ مولانا سمیع الحق کو طالبان کا روحانی باپ اور استاد کہا جاتا ہے اور افغانی طالبان کیلئے آج بھی ان کے الفاظ حکم کا درجہ رکھتے ہیں۔ 1990 میں جب نواز شریف نے حکومت بنالی تو مولانا سمیع الحق نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ آئی جے آئی کے منشور کے مطابق شریعت بل لایا جائے۔ نواز شریف نے کسی نہ کسی طرح اقتدار کے پہلے چھ ماہ تو گزار لئے لیکن پھر 1991 میں اس پر دباؤ بڑھنے لگا۔ دوسری طرف بینظیر نے بھی سڑکوں پر احتجاج کا سلسلہ شروع کرنے کا اعلان کر رکھا تھا اور نواز شریف اس وقت سخت تناؤ کی کیفیت میں آچکا تھا۔ نواز شریف نے فوری طور پر چند لفافہ مولویوں کا بورڈ بنا کر انہیں شریعت بل کا مسودہ بنانے کا ٹاسک دیا اور سمیع الحق سے چند ہفتے مزید حاصل کر لئے۔ مسودہ تیار ہوگیا اور اس کا سارا زور حاکم وقت یعنی وزیر اعظم کو 'امیر المومنین' ثابت کرنے پر تھا۔ نواز شریف کی طرف سے جب یہ مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو سینیٹر مولانا سمیع الحق نے اس کی دھجیاں اڑا دیں اور اسے شریعت کے ساتھ مذاق کے مترادف قرار دے دیا۔ اسی اثنا میں قومی اسمبلی سے ایک قرارداد کے ذریعے نواز شریف نے یہ مسودہ منظور کروا کر سینیٹ میں بھجوا دیا۔ مولانا سمیع الحق کیلئے صورتحال ناقابل برداشت ہو چکی تھی، چنانچہ انہوں نے ملک گیر ہڑتال کی کال دے دی جو خلاف توقع کامیاب رہی۔ اس ہڑتال کی کامیابی کے بعد ایک طرف نواز شریف پر دباؤ بہت بڑھ گیا اور دوسری طرف مولانا سمیع الحق کا حوصلہ بھی بلند ہوگیا کہ وہ نواز شریف کو مزید دباؤ میں لاسکیں۔ ایک دن سینیٹ میں مولانا سمیع الحق نے شریعت بل پر دھواں دھار تقریر کی اور نواز شریف کی حکومت گرانے کی دھمکی دیتے ہوئے آئی جے آئی سے نکلنے کا اعلان کر دیا۔ اگلے دن ملک کے ایک بڑے قومی اخبار کے فرنٹ پیج پر ایک خبر چھپ گئی جس میں اسلام آباد کی رہائشی "میڈم طاہرہ" کا انٹرویو چھپا تھا جو اسلام آباد میں ایک قحبہ خانہ یا عیاشی کا اڈا چلاتی تھی۔ طاہرہ، 35 سالہ عورت جو اسلام آباد کی معروف طوائف تھی، شراب اور اسلحہ کے ساتھ گرفتار ہوئی، میڈم طاہرہ نے اپنے انٹرویو میں دھانسو قسم کے انکشافات کر ڈالے۔ اس انٹرویو میں میڈم طاہرہ نے ایک طرف بہت سے سیاستدانوں کا نام لئے بغیر انہیں اپنے "مستقل گاہک" قرار دے دیا اور دوسری طرف یہ بھی کہہ دیا کہ مولانا سمیع الحق اس کے مستقل گاہکوں میں سے ایک ہیں اور 'مردانہ قوت' سے مالا مال ہیں۔ میڈم طاہرہ نے یہ بھی بتایا کہ مولانا سمیع الحق جنسی عمل کے دوران ایک "خاص" پوزیشن پسند کرتے ہیں جس کیلئے اس اخبار نے "سینڈوچ" کی اصطلاح استعمال کی اور بعد میں مولانا کیلئے 'سیمی سینڈوچ' کا لقب بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس انٹرویو نے پورے ملک میں آگ لگا دی۔ مولانا سمیع الحق پر چاروں طرف سے یلغار ہونا شروع ہوگئی اور انہیں سینیٹ میں آکر روتے ہوئے حلف اٹھا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانا پڑا لیکن چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں اور مولانا کی عیاشی کی خبر چھپ گئی۔ کچھ عرصے بعد مولانا نے سینیٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور دیوبندی مدارس کی مینجمنٹ اور طالبان پر فوکس شروع کر دیا اور یوں نواز شریف پر شریعت بل لانے کا دباؤ ختم ہوگیا۔ وہ میڈم طاہرہ کون تھی، کہاں سے آئی، کہاں گئی، کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ اس کے اتنے بڑے انکشاف کے بعد اس کے عیاشی کے اڈے کے خلاف کیا کاروائی ہوئی، اس کا بھی کچھ علم نہیں۔ جاننا چاہیں گے کہ میڈم طاہرہ کا انٹرویو کس اخبار میں چھپا تھا؟ یہ عظیم سعادت میر شکیل الرحمان کے اخبار 'دی نیوز' کو میسر آئی اور جس ٹیم نے اس انٹرویو کا انتظام کیا، اس کی قیادت سینئر اینکر پرسن کامران خان کر رہا تھا۔ داستان تاریخ کے پنوں سے کھل کر سامنے آگئی اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

❁❁❁

شعبہ پاکستان

ڈاکٹر عبدالسلام کا نوبیل انعام یافتہ الیکٹرو ویک نظریہ: کائنات کے ابتدائی مراحل کا احاطہ کرنے والی تھیوری کیا تھی اور یہ کیوں اہم ہے؟

تحریر: عمر دراز ننگیانہ

پاکستان سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام نے علمِ طبیعات کے میدان میں ایک نظریہ قریباً 50 برس قبل پیش کیا تھا۔ طبیعات کے میدان میں اس کی حیثیت اس قدر کلیدی ہے کہ آج بھی اسے نصاب میں معمول کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔

ان کا نظریہ الیکٹرو ویک تھیوری بعد میں سلام وینبرگ ماڈل کے نام سے جانا گیا۔ اس کی جدید شکل کو آج سٹینڈرڈ ماڈل کا نام دیا جاتا ہے۔ سٹیون وین برگ وہ امریکی سائنسدان ہیں جنھیں سنہ 1979 میں اس نظریے کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام اور شیلڈن لی گلاشو کے ہمراہ نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے نظریے میں پہلی مرتبہ یہ دعویٰ کیا کہ کائنات میں پائی جانے والی چار بنیادی قوتوں میں سے دو یعنی ویک فورس یا کمزور نیوکلیائی طاقت اور الیکٹرومیگنٹزم یا برقی مقناطیسیت بنیادی طور پر ایک ہی قوت کی دو شکلیں ہیں۔ انھوں نے ان دو طاقتوں کو متحد کیا اور اسے الیکٹرو ویک فورس کا نام دیا۔ ان کی اس دریافت سے کئی نتائج برآمد ہوئے اور اس نے کئی سائنسی پیشن گوئیوں کو جنم دیا۔ ان میں سے ایک ان بنیادی ذرات کے حوالے سے تھی جو اس وقت تک دیکھے نہیں گئے تھے۔ پاکستان میں ماہرِ علم طبیعات پروفیسر پرویز ہود بھائی نے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے نظریے کو طبیعات کے میدان میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ 'ان دو قوّتوں کو متحد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ ریاضی کے نقطہ نظر سے ان دونوں کی ساخت ایک جیسی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کام مانا گیا کیونکہ اس سے پھر طرح طرح کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔'

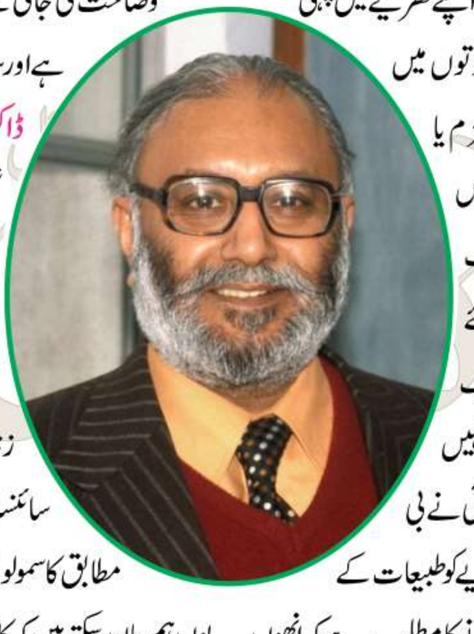

پروفیسر پرویز ہود بھائی کے مطابق ڈاکٹر سلام کے نظریے نے جن نتائج کو جنم دیا ان میں ایک انتہائی اہم یہ تھا کہ انھوں نے اس بات کی پیشن گوئی کی کہ 'کچھ ایسے ذرے ہیں جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں لیکن وہ اس وقت تک دیکھے نہیں گئے تھے۔'

یہ ذرے اس دریافت کے پندرہ برس کے بعد دیکھے گئے جب ان کو یورپی ادارہ برائے ایٹمی تحقیق میں تلاش کیا گیا۔

یہ ذروں اور قوتوں کا کھیل کیا ہے؟

کاسمولوجسٹ یا ماہرینِ علم کائنات یہ مانتے ہیں کہ کائنات ابتدا میں ذرات پر مشتمل روشنی اور قوت کا ایک انتہائی گرم مجموعہ تھا۔ پھر ایک بہت بڑا پھیلاؤ دیکھنے میں آیا جس سے کائنات کی حالیہ شکل کی طرف سفر کا آغاز ہوا۔ سائنسدانوں کے مطابق یہ بڑا پھیلاؤ ایک لمحے میں ہوا اور اس بنیادی پھیلاؤ کے عمل کو بگ بینگ کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کے ذریعے سورج، چاند، ستارے، سیارے اور دیگر اجرام فلکی کے وجود پانے کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اس نظریے کی بنیاد زیادہ تر علمِ کائنات کے مشاہدات میں ہے اور سائنس ثبوت مانگتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کا نظریہ ہمیں کائنات کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟

علمِ طبیعات کی ایک شاخ کو پارٹیکل فزکس کہا جاتا ہے جو بنیادی جوہری ذرات کی بناوٹ اور خصوصیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ماہرین انھی سائنسی ثبوتوں کو تلاش کرتی ہیں جن سے کائنات کے وجود اور اس میں پائے جانے والے اجرام اور زندگی کی تخلیق کی وضاحت کی جا سکے۔ ڈاکٹر عبدالسلام ان ہی سائنسدانوں میں سے ایک تھے۔ پروفیسر پرویز ہود بھائی کے مطابق کاسمولوجی کے میدان میں اتحاد کے اس نظریے کا اطلاق ہو سکتا ہے اور یوں ہم جان سکتے ہیں کہ کائنات کے ابتدائی لمحات کس طرح گزرے تھے۔ 'اس میں کس قسم کے ذرات تھے اور کیا درجہ حرارت تھا اور پھر جو مختلف عناصر ہیں جو بعد میں بنے وہ اس مقدار میں کیوں بنے جن کا آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔'

بنیادی ذرات کیا ہیں، کیسے وجود دیتے ہیں؟

ڈاکٹر عبدالسلام کے نظریے کو علمِ طبیعات میں کلیدی مقام کیوں حاصل ہے، اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ یہ بنیادی ذرات اور بنیادی قوتیں ہیں کیا اور ان کا کائنات اور اس کی تخلیق سے کیا تعلق ہے۔ سائنس کے مطابق ہمارے اردگرد موجود تمام مادہ بنیادی ذرات سے بنا ہے یعنی یہ بنیادی ذرات مادہ کے تعمیری بلاک ہیں۔ یہ دوسرے ذرات کو وزن دیتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک کھڑی ہوئی ٹرین کو اگر آپ اپنی جگہ سے ہلائیں گے تو آپ کو اس کا وزن محسوس ہوگا۔ یہ وہ وزن ہے جو اس کو بنانے والے بنیادی ذرات نے اس کو دیا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ

ان بنیادی ذرات کو اپنا وزن کہاں سے ملا؟

اس سوال کا جواب ہمیں آگے جا کر ڈاکٹر عبدالسلام کے نظریے کی وضاحت میں ملے گا۔ پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ بنیادی قوتیں کیا ہیں؟

کائنات میں موجود چار بنیادی قوتیں ہیں کیا؟

پروفیسر پرویز ہود بھائی اس کی وضاحت ایسے کرتے ہیں کہ 'ہم اپنی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ چار بنیادی قوتیں ہیں جن کی ہم الگ الگ شناخت کر سکتے ہیں۔ ان کو پھر ہم مختلف مساوات میں بند کرتے ہیں اور ان سے جو پیشن گوئیاں ہیں ان کی ہم مطابقت دیکھتے ہیں تجربے کے ساتھ۔' یہ طاقتیں بنیادی ذرات کو چلانے کی ذمہ دار ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو آپ کششِ ثقل کے نام سے جانتے ہیں۔ باقی تین میں الیکٹرومیگنٹزم، اسٹرانگ فورس اور ویک یا کمزور طاقت بتائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سلام اور وینبرگ ماڈل اور اس کی جدید شکل سٹینڈرڈ ماڈل ان تین قوتوں اور بنیادی ذرات کے تعلق کی بہترین وضاحت پیش کرتا ہے۔ یہ تین قوتیں ایسے ذرات کے تبادلے سے جنم لیتی ہیں جنھیں فورس کیریئر یا قوت رکھنے والے ذرات کہا جاتا ہے۔ ان ذرات کا تعلق جس گروہ سے ہے اسے 'بوسن' کہا جاتا ہے۔ کسی بھی مادے کے ذرات ایک دوسرے کے ساتھ ان ہی بوسن کے تبادلے کے ذریعے طاقت کی منتقلی کرتے ہیں۔

ان بنیادی طاقتوں کے میل جول سے کیا ہوتا ہے؟

پروفیسر پرویز ہود بھائی بتاتے ہیں کہ 'جب کائنات بنی تو اس وقت یہ چاروں قوتیں ایک قوت کے اندر ضم ہو گئی تھیں۔ جوں جوں کائنات پھیلتی چلی گئی تو ان میں فرق آتا چلا گیا' ہر بنیادی طاقت کا اپنا بوسن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے نظریے کے حوالے سے ہم یہاں ان میں سے دو ہی کو دیکھتے ہیں۔ الیکٹرومیگنیٹک کو فوٹون اٹھا کر چلتا ہے جبکہ کمزور قوت کو جو بوسن اٹھا کر چلتے ہیں انھیں 'ڈبلیو' اور 'زیڈ' کہا جاتا ہے۔ کمزور نیوکلائی قوت کے کام کرنے کی حد بہت محدود ہوتی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے بہت بڑے ذرات اٹھا کر چلتے ہیں۔ اور یہ کہ یعنی ڈبلیو اور زیڈ بوسن کا تو وزن تھا لیکن فوٹون کا کوئی وزن نہیں تھا۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے ان دونوں قوتوں کو یکجا کیسے کیا؟

ڈاکٹر عبدالسلام نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اگر چار ایسے ذرات موجود ہوں جو 'پیغام رساں' یا کیریئر ذرات ہوں۔ ان میں سے دو نیوٹرل ہوں اور دو برقی چارج رکھتے ہوں تو وہ الیکٹرو ویک اتحاد کو ممکن بنا سکتے تھے۔ اس طرح یہ معلوم ہوا کہ اس نظریے کا بنیادی توازن کسی ایسے لائحہ عمل میں پوشیدہ تھا جو کمزور نیوکلائی قوت کے تبادلے کے دوران منتقل ہونے والے ذرات کو تو وزن دیتا تھا مگر الیکٹرومیگنیٹک تبادلے کے دوران فوٹون کو وزن نہیں دیتا تھا۔

ان کی پیش گوئی کتنی اہم تھی؟

ڈاکٹر عبدالسلام اور وینبرگ کے نظریے میں پیش گوئی کی گئی کہ ایک ایسی اضافی فیلڈ یا میدان موجود ہے جو نظر نہیں آتا مگر پوری خلا میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے ساتھ تعامل یا میل جول سے ذرات کو وزن ملتا ہے۔ اس میں ہمارے اس سوال کا جواب بھی موجود ہے کہ بنیادی ذرات جن سے دوسرے ذرات بنتے ہیں یا وزن لیتے ہیں، ان کا اپنا وزن کہاں سے آتا ہے یا وہ کیسے بنے۔ اس وقت تک نہ دیکھے جانے والی اس فیلڈ یا میدان کو بعد میں ہگز بوسن کے نام سے جانا گیا اور اس کو اٹھا کر چلنے والے ذرے کو ہگز پارٹیکل کہا گیا جو اس نظریے کو پیش کرنے والے سائنسدان پیٹر ہگز کے نام سے منسوب ہے۔

ہگز بوسن کیا ہے؟

پروفیسر پرویز ہود بھائی کے مطابق ہگز نے سنہ 1964 میں ایک مضمون لکھا تھا جو الیکٹرو ویک تھیوری کے ضمن میں نہیں تھا۔ بس وہ ایک عجوبہ تھا کوانٹم فیلڈ تھیوری کے مضمون میں کہ ذرات کو وزن دیا جا سکتا ہے۔ سلام اور وائنبرگ نے اس کام کا اطلاق ویک اور الیکٹرومیگنیٹک تعامل پر کیا۔ پروفیسر ہود بھائی کے مطابق ان دونوں نے یہ لکھا کہ یہ بوسن موجود ہے تاہم ان کا نظریہ یہ نہیں بتا سکا کہ وہ کتنا بھاری ہوگا اس لیے اسے تجرباتی طور پر ڈھونڈنا پڑا۔ ہگز فیلڈ دوسرے بنیادی ذرات کی فیلڈ سے اس طرح مختلف تھی کہ اس کا حجم تو تھا مگر اس کی کوئی سمت نہیں تھی۔ اسی طرح باقی ذرات کے برعکس اس کے ذرے یعنی ہگز بوسن کی گردشی قدر صفر تھی۔ اس کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی طاقت اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب اس کی فیلڈ کی قدر صفر ہو۔

اس نے کائنات کی ابتدا کے سوال میں کس بات کی وضاحت کی؟

ہگز بوسن نظریے کے مطابق تمام بنیادی ذرات کو اس وقت وزن ملا جب انھوں نے ہگز فیلڈ کے ساتھ تعامل کیا اور یہ اس وقت ممکن ہوا تھا جب کائنات ٹھنڈی ہوئی اور ابتدائی بڑے پھیلاؤ یا بگ بینگ کے بعد اس میں موجود قوت کم ہوئی۔ بنیادی مادی ذرات کے مختلف اوزان بھی اس وجہ سے ہیں کہ انھوں نے مختلف قوت کے ساتھ ہگز فیلڈ کے ساتھ تعامل کیا۔ اس نظریے نے ڈاکٹر عبدالسلام کے اس نظریے کی بھی وضاحت کی کہ ویک فورس کے بوسن ڈبلیو اور زیڈ کیوں وزنی تھے جبکہ الیکٹرومیگنیٹک فورس کے فوٹون کا کوئی وزن نہیں تھا۔

یہ ڈاکٹر عبدالسلام ہی کا کام تھا

سنہ 2012 میں یورپی ادارہ برائے ایٹمی تحقیق میں سائنسدانوں نے ہگز بوسن کی تلاش کے لیے ایک بہت بڑا تجربہ کیا اور لارج ہیڈرون کولائیڈر نامی سنٹر پر سائنسدانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انھیں ایسا اشارہ موصول ہوا تھا جو ہگز بوسن سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ نظریہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے اور اس سے کئی نتائج برآمد ہوئے جن میں ایک اس سوال کی وضاحت بھی تھی کہ کائنات ایک لمحے میں کیسے پھیلی اور پھر اس کا مزید پھیلاؤ کیسے ممکن ہوا۔ پروفیسر پرویز ہود بھائی کے مطابق کائنات کے وجود کے بیانیے میں موجود ہزاروں چیزوں میں سے یہ صرف ایک چیز ہے۔ تاہم یہ ڈاکٹر عبدالسلام اور وائنبرگ ہی کا کام تھا جس کے ذریعے ہگز پارٹیکل دیکھا گیا اور دریافت ہوا۔

❁❁❁

شعبہ پاکستان

علامہ خادم رضوی اور عبدالستار ایدھی

تحریر: فرنود عالم

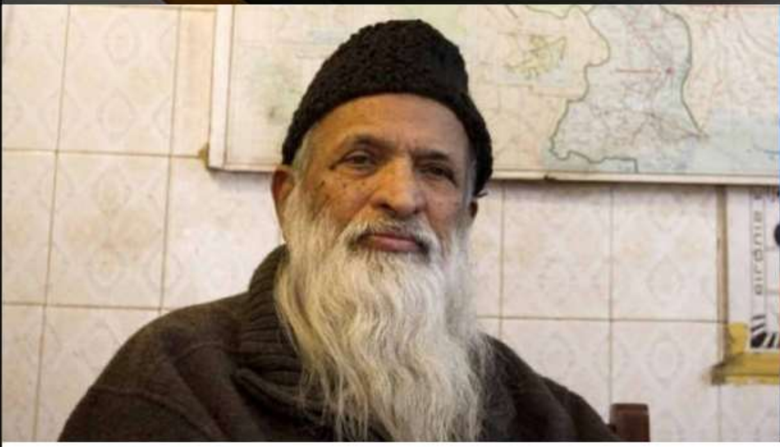

علامہ خادم رضوی اور عبدالستار ایدھی کی کراچی میں ایک بار خبر آئی کہ عبدالستار ایدھی کفن چور ہیں اور بردہ فروشی کرتے ہیں۔ معاملہ چلتے چلاتے کراچی کی ایک دینی جامعہ میں چلا گیا۔ جامعہ سے فتویٰ جاری ہوا، 'ایدھی کو چندہ دینے والے اپنی آخرت کی فکر کریں۔' اس کی دو چار مزید وجوہات بتاتے ہوئے فتوے میں لکھا گیا کہ وہ قادیانی ہیں، مرتد ہیں، غیر مسلموں پر خرچ کرتے ہیں اور 'ناجائز بچے' پالتے ہیں۔ اس فتوے پر سب سے نمایاں دستخط جس مفتی صاحب کے تھے، اپنے زمانے میں ان کا طوطی شہر کے سب سے بلند مینار پہ بیٹھ کر بولتا تھا۔ کراچی میں فرقہ واریت کی ایک منہ زور لہر چلی تو مفتی صاحب قتل کر دیے گئے۔ بہت برا ہوا۔ عجیب ہی زمانہ تھا، تب مجھ جیسے لوگ بھی رپورٹنگ کرلیا کرتے تھے۔ منہ اندھیرے کاغذ قلم لے کر قتل گاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ ہجوم میں پھنسی ایمبولینس دھیرے دھیرے سے جنازہ گاہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ عقبی دروازہ کھلا ہے، لوگ ہاتھ بڑھا کر جسدِ خاکی پر پڑے کاٹن کے ایک سفید کپڑے کو چھو رہے ہیں۔ جن کا ہاتھ مرحوم کی نعش تک نہیں پہنچ رہا وہ عقیدت سے ایمبولینس کو ہاتھ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یکا یک میری ایک آنکھ میں مرحوم کے فتوے کا اقتباس ابھر آیا، جس میں ایدھی کے لیے دشنام لکھا تھا۔ دوسری آنکھ اُن کے بدن پر پڑے سفید کپڑے میں الجھ گئی، جس پر جلی حروف میں ایدھی کا نام لکھا تھا۔ ایدھی صاحب کا انتقال ہوا تو کراچی ہی کے ایک حضرت کی بے رحم تقریر سامنے آ گئی۔ یہ بہت پرانی تقریر تھی جو موقعے کی مناسبت سے تازہ ہوگئی تھی۔ تقریر میں حضرت فرما رہے تھے، 'ایدھی بہت بڑا زندیق ہے۔ جو اس کا احترام کرتے ہیں وہ یہ ہیں اور جو چندہ دیتے ہیں وہ پتہ نہیں کیا ہیں۔'

ایک تو راسخ العقیدہ ہستیوں کے الفاظ نفاست سے اس قدر پاک ہوتے ہیں کہ قلم انہیں نقل کرنے کی تاب بھی نہیں لا پاتا۔ ایک شام کچھ موٹر سائیکل سوار آئے، حضرت کی جامعہ کے باہر فائرنگ کرتے ہوئے نکل گئے۔ ایک استاد اور تین طلبہ قتل ہو گئے۔ برا ہوا، بہت برا ہوا۔ صبح جنازہ گاہ پہنچے تو اعلان ہو رہا تھا کہ حضرت کی نعش سرد خانے سے لائی جا رہی ہے۔ کچھ دیر میں سائرن بجنے لگے، دیوہیکل دروازے کھلے اور ہجوم کے ساتھ تین ایمبولینسیں داخل ہوگئیں۔ یہ ایدھی کی ایمبولینسیں تھیں جو ایدھی سرد خانے سے یہاں پہنچی تھیں۔ ایک منظر میرے حافظے پر کچھ عجیب ہی رنگوں میں نقش ہو گیا۔ حضرت جنازہ پڑھا رہے ہیں اور سامنے رکھے ہوئے تابوت حضرتِ ایدھی کے دوشالے سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ خدا بخشے، علامہ خادم حسین رضوی بھی چلے گئے۔ پیچھے اب دو طرح کے لوگ انہیں یاد کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ تو علامہ کو اسی ریکارڈ کی روشنی میں یاد کر رہے ہیں، جو وہ پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہیں اب کھل کر علامہ کے نقطہ نظر سے اتفاق کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس دوسرے گروہ میں کچھ لوگ ہیں جو طبیعت کے بہت محتاط ہیں۔ یہ لوگ علامہ سے اتفاق بھی کر رہے ہیں مگر سر بچانے کے لیے 'اگر چہ علامہ کے طریقہ کار سے مجھے اختلاف تھا' والا ہیلمٹ بھی پہن کر کھیل رہے ہیں۔ انہی میں پھر کچھ لوگ وہ ہیں جو بات کہنے سے پہلے اعتدال کی تسبیح ضرور پڑھتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو کل سے علامہ کے لیے خلوص کے اضافی نمبروں کا تقاضا کر رہے ہیں۔

اتفاق کرنے والے ان سارے ہی گروہوں کو اس بات کی شکایت ہے کہ لوگ اب علامہ کی کیسٹیں چلا چلا کر ان سے اختلاف کا اظہار کیوں کر رہے ہیں۔ شکایت کرتے ہوئے وہ بھول رہے ہیں کہ یہ علامہ کا وہ ریکارڈ ہے جو ان کی ذاتی زندگی پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ریکارڈ محض نقطہ نظر کے اختلاف پر بھی مبنی نہیں ہے۔ یہ زندگی کی راہ میں سنجیدہ رکاوٹوں کا ایک ریکارڈ ہے۔ ایسا ریکارڈ، جسے قانون کی دستاویز سے کہیں بڑھ کر اہمیت

حاصل ہو چکی تھی۔ مذہبی مقدمہ تو علامہ ضمیر اختر نقوی کا بھی بہت کمزور تھا، مگر لوگوں نے بن مانگے انہیں خلوص کے اضافی نمبر دے دیے تھے۔ یہ نمبر اس لیے بھی دیے کہ وہ جوتوں سمیت کسی کی آنکھ میں گھسنے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے ماتم اچھی بات نہ ہو، مگر یہ رسم وہ دوسروں کے سینے پر ادا نہیں کرتے تھے۔ اپنے دائرے میں اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹتے تھے۔ کوئی بات اچھی نہ لگتی تو ہلاک نہیں کرتے تھے، خاموشی سے بلاک کر دیتے تھے۔ برا مان جاتے تو سخت سست ضرور کہہ جاتے تھے، توہینِ مذہب کی آڑ لے کر گردن ناپنے نہیں پہنچتے تھے۔ محلے کے اوباش بچوں کو آپ کے گھر کا پتہ بھی نہیں بتاتے تھے۔ بغیر ثبوت وشواہد کے عدالت اور تھانوں کا گھیراو کر کے وہ شہریوں کو سزائیں بھی نہیں دلواتے تھے۔ انہوں نے تو اپنے ذاتی گھر کو عام عوام کے لیے کتب خانہ بنانے کی وصیت کی ہوئی تھی۔ کون کرتا ہے؟ آج وہ نہیں ہیں، ان کے گھر کے دروازے طالب علموں کے لیے دن رات کھلے ہیں۔ اس کتب خانے میں الٰہیات اور ادب سے لے کر تاریخ وفلسفہ تک ہر مضمون موجود ہے۔ عبرانی اور عربی سے سے لے کر سنسکرت اور فارسی تک کیا ہے جو یہاں نہیں ہے۔ اس کتب خانے سے استفادے کے لیے آپ کو اپنا مذہب اور مسلک نہیں بتانا پڑتا۔ کوئی داروغہ آپ کے حلیے اور بود وباش کا جائزہ نہیں لیتا۔ کون ہے جو ایسے عالم کو نقطہ نظر کے اختلاف کے باوجود خلوص کے اضافی نمبر نہیں دے گا؟

آج میں جب علامہ کی اچھائیوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو شدھ پنجابی اور شستہ فارسی کے سوا کچھ بھی سامنے نہیں آ رہا۔ اس کے سوا جو بھی یاد آ رہا ہے اس میں زندگی کی دانستہ تذلیل، تسلط، مداخلت، جلاو گھیراؤ، تعاقب، دھونس، جبر اور نقصِ امن کے حوالوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ مرنے والوں کی تذلیل وتحقیر کو علامہ نے ثواب ہی نہیں بتایا تھا، ہاتھ کھڑے کروا کر اس روایت کو آگے بڑھانے کا وعدہ بھی لیا تھا۔ عاصمہ جہانگیر ابھی دفنائی بھی نہیں گئی تھیں کہ علامہ نے اُن کا کفن اور تابوت انسانیت سوز جملوں کے بھاڑ میں جھونک دیا تھا۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتا کہ کہیں مائک نہ پلید ہو جائے۔ ایک موقعے پر فرمایا، مسجد میں بیٹھا ہوں اس لیے اس کا نام نہیں لے رہا۔ عاصمہ جہانگیر تو چلیے مردودِ حرم تھیں، جنید جمشید تو کم از کم حرم کے پاسبانوں میں شمار رکھتے تھے؟ عین اس وقت کہ جب جنازے کی تکبیر کہی جا رہی تھی، علامہ کے مریدوں نے آگے بڑھ کر تابوت کو لات ماردی تھی۔ یعنی جنید کے وجود میں بچا ہی کیا تھا جو ہم تین دن تک نوچ رہے تھے؟

عبدالستار ایدھی کا انتقال ہوا تو علامہ بہشت کے دروازوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کسی طور اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ ایدھی صاحب کی بخشش ہو سکے۔ وہ اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ ایدھی صاحب نے کسی بچے کو کبھی ناجائز کیوں نہیں سمجھا۔ پیدا ہونے والے کسی بھی بچے کا زندگی پر وہ حق کیوں تسلیم کرتے تھے۔ انہیں اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ جاتے جاتے ایدھی صاحب نے اپنی آنکھیں کیوں دان کر دی تھیں؟

علامہ دنیا سے گئے ہیں تو پیچھے ’سر تن سے جدا‘ جیسے نعرے چھوڑ گئے ہیں، جوان کی گلی میں رات سے لاؤڈ سپیکروں پر گونج رہے ہیں۔ ایدھی گئے تھے تو اپنی دو آنکھیں چھوڑ گئے تھے، جو 16 سال سے نابینا ایک خاتون کو لگا دی گئی تھیں۔ وہ چپ چاپ آنکھیں کہیں سے دیکھ رہی ہیں کہ ایک ایمبولینس علامہ کا جسدِ خاکی لے کر گزر رہی ہے، جسے لوگ عقیدت سے چھو رہے ہیں۔ جس جگہ کو وہ چھو رہے ہیں وہاں جلی حروف میں ایدھی لکھا ہے۔

نقصِ امن کے حوالوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ مرنے والوں کی تذلیل وتحقیر کو علامہ نے ثواب ہی نہیں بتایا تھا، ہاتھ کھڑے کروا کر اس روایت کو آگے بڑھانے کا وعدہ بھی لیا تھا۔ عاصمہ جہانگیر ابھی دفنائی بھی نہیں گئی تھیں کہ علامہ نے اُن کا کفن اور تابوت انسانیت سوز جملوں کے بھاڑ میں جھونک دیا تھا۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتا کہ کہیں مائک نہ پلید ہو جائے۔ ایک موقعے پر فرمایا، مسجد میں بیٹھا ہوں اس لیے اس کا نام نہیں لے رہا۔ عاصمہ جہانگیر تو چلیے مردودِ حرم تھیں، جنید جمشید تو کم از کم حرم کے پاسبانوں میں شمار رکھتے تھے؟ عین اس وقت کہ جب جنازے کی تکبیر کہی جا رہی تھی، علامہ کے مریدوں نے آگے بڑھ کر تابوت کو لات ماردی تھی۔ یعنی جنید کے وجود میں بچا ہی کیا تھا جو ہم تین دن تک نوچ رہے تھے؟

عبدالستار ایدھی کا انتقال ہوا تو علامہ بہشت کے دروازوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کسی طور اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ ایدھی صاحب کی بخشش ہو سکے۔ وہ اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ ایدھی صاحب نے کسی بچے کو کبھی ناجائز کیوں نہیں سمجھا۔ پیدا ہونے والے کسی بھی بچے کا زندگی پر وہ حق کیوں تسلیم کرتے تھے۔ انہیں اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ جاتے جاتے ایدھی صاحب نے اپنی آنکھیں کیوں دان کر دی تھیں؟

علامہ دنیا سے گئے ہیں تو پیچھے ’سر تن سے جدا‘ جیسے نعرے چھوڑ گئے ہیں، جوان کی گلی میں رات سے لاؤڈ سپیکروں پر گونج رہے ہیں۔ ایدھی گئے تھے تو اپنی دو آنکھیں چھوڑ گئے تھے، جو 16 سال سے نابینا ایک خاتون کو لگا دی گئی تھیں۔ وہ چپ چاپ آنکھیں کہیں سے دیکھ رہی ہیں کہ ایک ایمبولینس علامہ کا جسدِ خاکی لے کر گزر رہی ہے، جسے لوگ عقیدت سے چھو رہے ہیں۔ جس جگہ کو وہ چھو رہے ہیں وہاں جلی حروف میں ایدھی لکھا ہے۔ (انڈیپنڈنٹ، اردو)

میر گل خان نصیر مصورِ بلوچستان

تحریر: عابد میر

پابلو نرودا نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف Memoirs میں ایک جگہ لکھا ہے:

Anyone who has not been in the Chilea's forest does not know this planet.

یعنی جو شخص چلی کے جنگلات میں نہیں رہا، وہ اس کرۂ ارض کو نہیں جان سکتا۔ بعینہٖ یہی بات بلوچستان کے معاملے میں کہی جا سکتی ہے کہ جو بلوچستان کے پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں میں نہیں رہا، وہ اس سیارے سے واقف نہیں ہو سکتا۔ لیکن وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ نے گل خان نصیر کی شاعری پڑھ لی (اور محسوس کر کے پڑھی) تو سمجھیں آپ نے آدھا بلوچستان جان لیا۔ آدھا اس لیے کہ محبت کا بیاں خواہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو، اس میں محبت کرنے جیسا لطف نہیں ہو سکتا۔ سو، بلوچستان کو مکمل جاننے کے لیے تو وہاں ہونا ضروری ہے، اور اگر وہاں تک رسائی نہیں، تو گل خان کا کلام ہے نا۔ ایک مکمل ٹُورِسٹ گائیڈ!

میر گل خان نصیر بلوچستان کے سماجی حقیقت حقیقت نگار تو ہیں ہی، ساتھ ہی انھوں نے اپنی شاعری میں بلوچستان کی خوب صورت نقش کاری بھی کی ہے۔ کبھی وہ دریائے جیونی کے کنارے بیٹھے آنسو بہا رہے ہوتے ہیں، تو کبھی بولان سے گزرتے ہوئے لاری میں بیٹھے بیٹھے اس منظر کو الفاظ میں قید کر لیتے ہیں، تو کبھی اس دیس کے مختلف مناظر کو میرا دیس پیارا کے عنوان سے تفصیلاً قلم بند کرتے ہیں۔ گل خان نصیر کی یہ لفظی نقش کاری ذرا رک کر، ٹھہر کر، ذرا سی توجہ بھرے مطالِعہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اصل میں بلوچستان ہر معاملے میں سنجیدگی کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہاں آپ کہیں بھی سرسری نہیں گزر سکتے۔ اس کے تو دشوار گزار راستے، استاد ڈرائیوروں سے بھی مشاقی مانگتے ہیں۔

کہتے ہیں ٹرک ڈرائیور کو جب اپنے اسسٹنٹ کو ڈرائیونگ کی فائنل کلاس دینی ہو تو بہ بطورِ امتحان وہ اسے بولان کی پُرپیچ پہاڑیوں میں لے آتا ہے۔ کسی سرکاری اہل کار کا امتحان مقصود ہو تو اسے سوئی یا کوہلو کے کالا پانی میں بھیج دیا جاتا ہے؛ یعنی یہ سرزمین سہل پسندی کو گوارا نہیں کرتی، یہ ہر معاملے میں perfection مانگتی ہے۔ حسن سے لے کر فن تک، محبت سے لے کر سیاست تک، اگر آپ بلوچستان میں ہیں، تو آپ کو سنجیدہ ہونا ہوگا، بھاری پن چاہیے ہوگا، اعلیٰ ظرفی چاہیے ہوگی۔ یوں تو بلوچستان گل خان نصیر کی شاعری کے مرکزی موضوعات میں سے ہے، بلکہ موضوع کوئی بھی ہو، بلوچستان اس کا complimentary حصہ ہوتا ہے۔ یہی شاعر کا اول و آخر ہے۔ یہی اس کی حمد و نعت ہے۔ یہی اس کا بسم اللہ ہے۔ البتہ ان کے اردو مطبوعہ کلام میں دو تین نظمیں ایسی ہیں جنھیں بلوچستان کا شعری پورٹریٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں ہمارا مطالِعہ انھی نظموں سے متعلق ہے۔ پہلی نظم بولان کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ جس کی ذیلی سرخی میں گل خان نصیر نے اس کا سببِ وُرُود ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

مورخہ ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۴۸ کو بولان سے گزرتے وقت لاری میں لکھے گئے۔ (۱)

نیز اس کے آخر میں نا تمام بھی لکھا ہے، حالاں کہ اپنے موضوع اور تاثر کے لحاظ سے یہ ایک مکمل نظم ہے۔ ممکن ہے شاعر کے ذہن میں اس کی وسعت سے متعلق کوئی خیال موجود ہے، جسے وہ مذکورہ نظم کا حصہ بنانا چاہتا ہو، لیکن آگے اس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔

آیئے پہلے نظم کی قرأت کرتے ہیں:

خشک و بے مہر چٹانوں کا تراشیدہ حصار
تپشِ مہر سے جھلسی ہوئی سنگین دیوار
جھریاں چہرۂ پر ہول پہ ادواروں کی
گھاؤ رِستے ہوئے، شمشیر سے قہاروں کی
پیرِ فرتوتِ کہن سالہِ زابل کی طرح
بُھنویں سکڑی ہوئی ابھرے ہوئے ماتھے پہ تناؤ
جیسے کوہ زاد سے رستم کے بگڑ جانے پر
اس نے زابل کے بلوچوں پہ نظر ڈالی تھی!
اس طرح آج بھی بولان کی گھاٹی ہر دم
اُسی مشتاق مگر تُند نظر سے ہم کو دیکھتی ہے!
کسی کوہ زاد سے ٹکرانے کو

یہ پوری نظم منظرکشی کا شاہکار ہے۔ اس کے اوّلین مصرعے ہی ہمیں بلوچستان کے لینڈ اسکیپ کا بھرپُور عکس دکھاتے ہیں:

خشک و بے مہر چٹانوں کا تراشیدہ حصار
تپشِ مہر سے جھلسی ہوئی سنگین دیوار

آپ نے کبھی بولان کا سفر کیا ہو تو یہ لینڈ اسکیپ آپ کے لیے ہرگز اجنبی نہ ہوگا، اور اگر کبھی یہ سفر کرنے کی تمنا ہے تو پھر یہ آپ کے لیے زبردست مخیلہ، imagination کا باعث بنے گا۔ دوسری جانب شاعرانہ خیال ملاحظہ ہو: چٹانیں تراشیدہ ہیں، گویا کسی نے تراش کر وہاں رکھی ہوں۔ لیکن شاعر چٹانوں کے اس حصار کو خشک و بے مہر قرار دیتا ہے۔ محض چٹانوں کا ذکر ہو تو اس سے بلوچستان کا لینڈ اسکیپ ذہن میں نہیں ہوتا، لیکن

اگر خشک و بے مہر چٹانوں کی تشبیہ استعمال ہو تو واضح ہے کہ بلوچستان کے پہاڑوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اگلے مصرعے میں پھر شاعر سنگین دیوار کو مہر (آفتاب) کی تپش سے جھلسا ہوا ظاہر کرتا ہے۔ یعنی پہاڑ خود تو بے مہر ہیں لیکن یہاں آفتاب کی ایسی گرمی پڑی ہے کہ سنگین دیواریں اس سے جھلسی ہوئی ہیں۔ یہ خیال بلوچستان کے طبعی ماحول سے بھی رُو شناس کراتا ہے۔

اب منظر کشی سے جُزئیات نگاری کا شاہکار دیکھیے:

جھریاں چہرۂ پُر ہول پہ ادواروں کی
گھاؤ رِستے ہوئے، شمشیر سے قہاروں کی

کبھی چٹانوں کے چہرے پہ جھریاں دیکھی ہیں آپ نے؟ یہی تو کمال ہے شاعر کا! یہ آپ کو ان جزئیات سے آگاہ کراتا ہے، جن کی جانب کبھی آپ کی توجُہ ہی نہیں گئی ہوتی۔

❁❁❁

تحریر: فیض احمد فیض

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
ویراں ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے
بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

❁❁❁

تحریر: یاسر چٹھہ

ایک پنجابی گاؤں میں شیعہ سنی تقسیم کا ایک منظر

آہ، یہ ہوا۔

ہمارا دو ہزار کی آبادی کا حافظ آباد کے قریب گاؤں ہے۔ ستر کی دھائی کے آخری برس تھے۔ یہاں خدا کا گھر مشترکہ مسجد تھی۔ شیعہ سنی ایک جگہ نماز پڑھتے تھے۔ وقت کی ایکتا فطری انصاف سے بہ ضرورت تقسیم ہو جاتی تھی۔ پھر جڑ جاتی تھی۔ جیسے درخت کے پتّے شام کو اپنے اوپر کمبل اوڑھ کر سکڑ جاتے ہیں اور صبح کو ہاتھ پاؤں دراز کر لیتے ہیں، کھل جاتے ہیں۔ مسجد کے لیے فرش پر پڑی صفیں باوضو ہی رہتی تھیں؛ کسی بھی انداز سے ادا کی گئی نماز سے ان کا وضو خطا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر وقت کی اکائی اور ایکتا جس کا ملجگا تنوع بھی واحد رنگ کی روشنی تھی؛ جیسے واحد رنگ کی روشنی اپنے سات رنگوں کے اجتماع کو باہم نرم گرم مٹھی میں سمیٹے رکھتی ہے۔ جانے کسی آدم و حوا کو کہیں سے مفت میں گندم ملی تھی؟ بہر حال، ایران میں انقلاب تھا، اور افغانستان میں بھی انقلاب تھا۔

اور روشنی ٹوٹ کر اوندھے مُنہ گری، ہمارے دو ہزار آبادی کے گاؤں پر۔

وقت کی اس ایکتا کے ایسے مقام پر چوٹ پڑی جو چوٹ مقامی نہ تھی۔ سرحدوں سے باہر کی چوٹ تھی۔

نتیجہ!

وقت میں پاٹ پڑ گیا۔

کسی بھی وقت کے لیے سب سے درد آمیز وہ لمحہ ہوتا ہے جب اس میں پاٹ پڑنے کا سمے ہوتا ہے۔ پھر لوگ لڑے، خون بہا اور آج تک وہ گاؤں سرکاری ریکارڈوں میں سرخ رنگ کے دائرے میں ہے۔

وہ گاؤں جو ایک مسجد میں اپنے رب سے کلام کر لیتا تھا اب چار پانچ عبادت گاہوں میں بھی نہیں سماتا۔ بس یہ دیکھیے دِلوں میں جگہ کم ہو جانے کی تنگ دامانیاں! (گو کہ آبادی تو بہت زیادہ نہ بڑھی۔) بس یہ جگہ جگہ کی کہانی ہے۔ بے جوڑ کہانی، بھدی اور synthetic کہانی۔

❁❁❁

شعبہ پاکستان

رپورٹ رحمت اللہ میر بلوچ

بیوروچیف بلوچستان

صوبائی ڈائریکٹر کالجز ہائیر ایجوکیشن بلوچستان پروفیسر ربابہ حمید درانی نے کہاہے کہ اساتذہ اور طلبہ کرپشن کے ناسور کے خاتمہ کے لئے بھرپور کردار ادا کریں پروفیسرز اپنے فرائض منصبی احسن طریقے سے سرانجام دیں اساتذہ اور طلبہ وقت کی پابندی کرکے اپنی تمام تر توجہ تعلیم کی طرف مرکوز رکھیں نقل اور کاپی کلچر سے گریز کریں جب تک ہم اپنی خواہشات پر قابو نہ کرسکیں گے اس وقت تک معاشرہ سے بدعنوانی کا خاتمہ ممکن نہیں آج انسداد بدعنوانی کے دن کو مناتے ہوئے ہرکوئی اپنے آپ کو بدعنوانی سے بری الذمہ قرار دیکر دوسروں کو بدعنوانی کا ذمہ دار ٹھرانے کی کوشش کرتا ہے آج ہم عہد کریں کہ ہم اپنا خود محاسبہ کرکے بدعنوانی کی لعنت سے باآسانی چھٹکارہ حاصل کریں طلبہ اپنی تمام تر توجہ اپنی پڑھائی کی جانب دیں نصیر آباد ڈویژن کے مختلف کالجز سے طلبہ اور طالبات آج کے اس پروگرام میں حصہ لیکر کامیابی حاصل کی ہے ان سب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جنہوں نے پوزیشن نہیں لی ہے وہ بھی ہمت نہ ہاریں بلکہ مقابلوں میں حصہ لیتے رہیں ان خیالات کا اظہار انہوں نے نیب بلوچستان اور ڈائریکٹوریٹ کالجز کی جانب سے بدعنوانی کے دن کے موقع پر منعقدہ نصیر آباد ڈویژن کے گرلز اور بوائز کالجز کے طلباو طالبات کے مابین اردو اور انگریزی تقریری مقابلہ بعنوان

تمہیں سب ہے خبر لٹیروں کے ٹھکانوں کی
شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے

گورنمنٹ ڈگری کالج ڈیرہ مراد جمالی میں تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا اس موقع پر اوّل دوئم اور سوئم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات میں کپ اور نقد انعامات تقسیم کیا ڈائریکٹر کالجز کے ہمراہ ڈپٹی ڈائریکٹر پلاننگ کالجز پروفیسر عصمت اللہ اسسٹنٹ ہلانگ کالجز پروفیسر قیصر خان محبوب علی گل محمد اور پی اے ڈائریکٹر کالجز بھی تھے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض پروفیسر میاں فیض محمد اور پروفیسر خادم سللطان نے سرانجام دیئے پروگرام کا آغاز باقاعدہ تلاوت کلام پاک اور نعت رسول مقبول ﷺ سے کیا گیا پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج ڈیرہ مراد جمالی پروفیسر جان محمد کھوسہ نے اپنے کالج پروفیسرز کے ہمراہ کالج گیٹ پر ڈائریکٹر کالجز پروفیسر ربابہ حمید درانی کوخوش آمدید کیا اور مہمان سے تمام پروفیسرز کا تعارف بھی کرایا گیا اور طلبا نے ڈائریکٹر کالجز کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا اوران پر پھولوں کی پتیاں بھی نچھاور کیں پرنسپل کالج ھذا پروفیسر جان محمد کھوسہ اور پروفیسر رانجھا خان پندرانی نے مہمان خاص اور دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے ڈائریکٹر کالجز پروفیسر ربابہ حمید درانی پروفیسر عصمت اللہ اسسٹنٹ پلاننگ کالجز پروفیسر قیصر خان پی اے ٹو ڈائریکٹر کالجز اور نصیر آباد ڈویژن کے مختلف کالجز کے پرنسپلز پروفیسر محمد اکبر سومرو پروفیسر محمد ایوب کھوسہ پروفیسر محمد ایوب منگریو پروفیسر عبدلباقی سمالانی پروفیسر منظور احمد وفا پروفیسر علی رضا عمرانی پروفیسر عبدالرزاق داجلی اور مختلف گرلز کالجز کے پرنسپلز اور اردو انگریزی تقاریروں کے ججز صاحبان پروفیسر سمیع اللہ کھوسہ پروفیسر غوث بخش کھوسہ پروفیسر منظور وفا پروفیسر علی رضا عمرانی و دیگر کو اجرک کا تحفہ پیش کیا اس سے قبل ڈائریکٹر کالجز نے کالج کی سبزہ زارلان میں شجرکاری کے سلسلے میں پودا بھی لگایا اور پرنسپل کے ہمراہ کالج میں جاری بی ایس سیکشن میں ترقیاتی کام کا جائزہ بھی لیا مختلف لیب اور کمپیوٹر لیب کا بھی دورہ کیا پرنسپل کالج ھذا پروفیسر جان محمد کھوسو کے خدمات کو بھی سراہا پروگرام کے اختتام پر مہمانوں اور طلباء و طالبات کے اعزاز میں ظہرانہ بھی دیا گیا۔

۞۞۞

وزیراعظم عمران خان نے تربت میں مختلف ترقیاتی منصوبوں کا سنگ بنیاد رکھ دیا

وزیراعظم عمران خان کا تربت یونیورسٹی میں مختلف ترقیاتی منصوبوں کا سنگ بنیاد رکھے جانے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہنا تھا کہ تربت کی اپنی ایک تاریخ ہے اور پہلی باریہاں آنے کی بہت خوشی ہے، تربت اور بلوچستان کے نوجوان پاکستان کا مستقبل ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ علم انسان کو دیگر مخلوقات سے منفرد بناتا ہے، تعلیم کے بغیر کسی معاشرے نے ترقی نہیں کی، آج ہم پیچھے رہ گئے ہیں اور جو علاقے پیچھے رہ گئے ہیں وہاں تعلیم بھی کم ہے، بلوچستان میں کبھی بھی اتنی فنڈنگ نہیں ہوئی جتنی ہماری حکومت نے کی ہے، ماضی میں

بلوچستان میں فنڈنگ نہ ہونے کی وجہ سے یہ صوبہ پیچھے چلا گیا، لیکن ہم بلوچستان کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔

عمران خان نے کہا کہ ہم خاص طور پر بلوچستان میں تعلیم کے شعبے میں مدد کریں گے کیونکہ بلوچستان کو پڑھے لکھے لوگوں کی شدید ضرورت ہے، اب شہروں میں جا کر تعلیم لینا ضروری نہیں ہے، بلوچستان کے طلباء وطالبات کے لیے اسکالرشپ 185 سے بڑھا کر 360 کر رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ غلطیاں انسان کو سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں، دنیا میں کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا، ہر مشکل وقت سے نکلنے کے بعد آپ تگڑے ہو جاتے ہیں، برے وقت سے کبھی نہ ڈریں، ناکامی سے کبھی نہیں گھبرائیں، جو اوپر جاتا ہے اس میں سب سے بڑی صفت ہار نہ ماننے کی ہوتی ہے۔

تربت وزیر اعلی بلوچستان جام کمال کا خطاب

وزیر اعظم کا بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے صوبے کے لیے پیکج کا اعلان کیا۔

تربت وزیر اعظم عمران خان کا عمائدین سے خطاب۔

ماضی میں رہنماؤں نے بلوچستان سے زیادہ انگلینڈ کے دورے کئے وزیر اعظم۔

نیا پاکستان ہاؤسنگ اسکیم بلوچستان لے کر آرہے ہیں۔

ہمارا مقصد بلوچستان کو اوپر اٹھانا ہے۔

سیاستدانوں نے ملک سے زیادہ خود کو فائدہ پہنچایا۔

چین نے عوام کو غربت سے نکالا اور سپر پاور بن گیا۔

بلوچ سیاست دانوں نے عوام سے زیادہ اپنا سوچا۔

پورے پاکستان میں ایسے سیاستدان موجود ہے جنہوں نے اپنے مفادات کے بارے میں سوچا۔

پچھلے چار ماہ میں پاکستان نے کوئی قرضہ نہیں لیا۔

بلوچستان میں ترقی نہ ہونے کی وجہ ماضی کے سیاستدان حکمران ہیں۔

ایک ایسے وزیر اعظم بھی آئے جنہوں نے بلوچستان سے زیادہ لندن کے دورے کیے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم چین کے ساتھ منسلک ہیں۔

بلوچستان قدرتی وسائل سے مالا مال ہے بلوچستان کے وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے تو پورے پاکستان کے قرضے ختم ہو سکتے ہیں۔ سابق سینیٹر وسابق وفاقی الحاج سردار فتح محمد محمد حسنی

قدرتی وسائل سے مالا مال بلوچستان کے وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے تو پورے پاکستان کے قرضے ختم ہو سکتے ہیں۔

سابق سینیٹر وسابق وفاقی وزیر الحاج سردار فتح محمد محمد حسنی

ان خیالات کا اظہار الفتح پینل کے سربراہ سابق سینیٹر و سابق وفاقی وزیر الحاج سردار فتح محمد محمد حسنی نے نوشکی کے دورہ کے موقع پر لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بلوچستان قدرتی وسائل سے مالا مال ہے بلوچستان کے وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے تو پورے پاکستان کے قرضے ختم ہو سکتے ہے مگر بدقسمتی سے پاکستان میں ایسی قیادت نہیں جو بلوچستان کے وسائل کو صحیح طور پر استعمال کریں سی پیک ماسٹر پلان پر عمل درآمد نہ کرنا نااہلی ہے سی پیک نہ صرف بلوچستان اور پاکستان بلکہ پورے خطے کیلئے گیم چینجر ہوگا مگر اس کیلئے ضروری ہے کہ ماسٹر پلان پر عمل درآمد کیا جائے۔ بلوچستان کے جزیروں سے متعلق ایک سوال پر الحاج سردار فتح محمد محمد حسنی نے کہا کہ کسی صورت بلوچستان کے جزیرے وفاق کے حوالہ کرنے کی حمایت نہیں کرینگے اور نہ ہی جنوبی بلوچستان بنانے دینگے بلوچستان ایک تھا ایک ہے اور ایک ہی رہیگا الحاج سردار فتح محمد محمد حسنی نے کہا کہ بہت جلد الفتح پینل کو پارٹی کی شکل دینگے جو بلوچستان اور سندھ کی سطح پر مضبوط سیاسی پارٹی ہوگی اس سلسلے میں سیاسی دوستوں اور حمایتوں سے مشاورت جاری ہے انہوں نے کہا کہ نئی پارٹی بنانے کا مقصد بلاتفریق عوامی خدمت ہے بلوچستان اور سندھ میں بیروزگاری اور مہنگائی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس سے بدامنی بڑھ رہی ہے پاکستان کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مخلصی سے بلوچستان کے وسائل کو استعمال کیا جائے۔۔۔

خوشخبری

کیا آپ اپنے یا اپنے کسی عزیز رشتہ دار کے بچوں کے رشتہ سے متعلق پریشان ہیں؟اور آپکو ملک یا بیرون ملک مناسب رشتہ کی تلاش ہے تو **"آبگینے بندھن"** لایا ہے آپکے لئے ایسا پلیٹ فارم جہاں پر آپ اپنی خواہش کے مطابق بہترین وبااعتماد تلاش کرسکیں گے۔ ہم رشتہ ناتا سے متعلق خواتین وحضرات کی معاونت، مدد اور خدمت کے لئے کوشاں ہیں۔خواہشمند افراد رابطہ کریں۔

"بے شک رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں مگر یہ سلسلے پایۂ تکمیل زمین پاتے ہیں"

آج کے دور میں دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مسئلہ اچھے اور مناسب رشتے کی تلاش ہے۔آپکے اپنے رسالے "آبگینے" کی انتظامیہ نے عصر حاضر کے اس گھمبیر مسئلے کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے اس سلسلے میں محض فی سبیل للہ نیک نیتی اور احباب کی مدد سے ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور **"آبگینے بندھن"** ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں پر احباب کو دنیا بھر سے موزوں و مناسب رشتے کی تلاش میں معاونت فراہم کی جائے گی۔

اس پلیٹ فارم پر مخلص احباب اکٹھے ہوکر ایک دوسرے کے ساتھ اچھے رشتوں کی تلاش و فراہمی میں معاونت کرسکیں گے۔

رشتہ کے لئے امیدوار کو ایک فارم فل کر کے گروپ ایڈمن کو بھیجنا ہوگا۔ اس فارم میں تمام مطلوبہ کوائف اور درست معلومات فراہم کرنا ضروری ہے۔

احتیاط کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے گروپ میں شامل ہونے سے قبل ممبرشپ ضروری ہے جس میں امیدوار (بچے، بچی) کے تمام کوائف درج ہونگے۔

کسی بھی قسم کی غلط بیانی یا دروغ گوئی پر ممبر کو گروپ سے ریمو کر دیا جائے گا۔

رشتہ سے متعلق حتمی انفرادی تحقیق دونوں فریق خود کریں گے اور اپنی صوابدید پر رشتہ طے کرنے کا فیصلہ کریں گے گروپ انتظامیہ کسی بھی صورت میں ذمہ دار نہیں ہوگی۔

رابطہ کے لئے: محی الدین عباسی

+447940077852

m.abbasi.uk@gmail.com

اسپ لیلیٰ: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وہ گھوڑی جس کے حصول کے لیے 12 ہزار جانیں داؤ پر لگیں

تحریر: وقار مصطفیٰ

19 ویں صدی کا 30 واں سال۔ اندرون شہر کی سڑکوں کو رگڑ رگڑ کر دو روز تک دھویا جانا اشارہ دے رہا تھا کہ جسے ان پر چلنا ہے وہ انتہائی خاص ہے۔

لاہور تب پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی راجدھانی تھا۔ 19 برس کی عمر میں جولائی سنہ 1799 میں لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے نام رنجیت یعنی میدانِ جنگ میں فاتح کی لاج رکھتے ہوئے گوجراں والا کے یہ سکھ جاٹ جنگجو امرتسر، کشمیر، ملتان، دہلی، لداخ اور پشاور تک اپنی سلطنت کو وسعت دے چکے تھے۔ 40 برس تک پنجاب پر حکمران رہنے والے رنجیت سنگھ پاؤں زمین کی بجائے رکاب میں رکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کے شاہی اصطبل میں 12 ہزار گھوڑے تھے اور کہا جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی 20 ہزار روپیوں سے کم میں خریدا نہیں گیا تھا۔ ان میں سے ایک ہزار گھوڑے صرف مہاراجہ کے لیے مخصوص تھے۔ وہ تھکے بغیر گھنٹوں گھڑسواری کر سکتے تھے۔ کوئی پریشانی ہوتی یا غصہ وہ گھڑسواری سے اپنے حواس بحال کرتے۔ دو گھوڑے ہمیشہ ان کی سواری کے لیے تیار ہوتے تھے اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ان کا دماغ خوب چلتا۔ مہمانوں سے گفتگو گھوڑوں ہی کے موضوع پر کرنا پسند تھا اور ان کے دوست جانتے تھے کہ اچھی نسل کا گھوڑا رنجیت سنگھ کی کمزوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز بادشاہ نے جہاں انھیں سکاٹش گھوڑے تحفے میں دیے تو حیدرآباد کے نظام نے بڑی تعداد میں عربی گھوڑے بھجوائے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے گھوڑوں کو نسیم، روحی اور گوہر بار جیسے شاعرانہ نام دے رکھے تھے۔ خوبصورت گھوڑوں کے تو وہ گویا دیوانے تھے اور انھیں حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ اس کی مثال جھنگ کے ایک نواب سے گھوڑوں کے مطالبے اور انکار پر ہونے والی پیش قدمی ہے۔ مہاراجہ کو کہیں سے علم ہوا کہ جھنگ کے نواب کے پاس بہت اچھے گھوڑے ہیں۔ پیغام بھجوایا کہ ان میں سے چند بطور تحفہ دیے جائیں۔ نواب نے اس درخواست کا مذاق اڑاتے ہوئے انکار کر دیا جس پر رنجیت سنگھ نے حملہ کر کے نواب کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ نواب اس وقت تو ان گھوڑوں کو لے کر فرار ہو گیا مگر چند روز بعد واپس آیا اور انھیں مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ایسا ہی کچھ شیریں نامی گھوڑے کے لیے ہوا جب شہزادہ کھڑک سنگھ کی کمان میں فوج کشی ہوئی اور اس کے مالک شیر خان نے دس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر کے بدلے یہ گھوڑا رنجیت سنگھ کو دینا منظور کیا۔ سبک رفتار سفید پری نامی گھوڑی منکیرہ کے نواب کے پاس تھی۔ رنجیت سنگھ کا دل اس پر آیا تو اپنے جرنیل مصر چند دیوان کو لکھا کہ وہ نواب سے گھوڑا طلب کریں اور اگر انکار کریں تو ان کی جائیداد چھین لی جائے۔ لاہور کے جن راستوں کی صفائی کا ذکر مضمون کے آغاز میں ہوا وہ بھی ایک گھوڑی کے لیے آراستہ ہو رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسپ لیلیٰ کہلائے جانے والے مہاراجہ کے اس پسندیدہ جانور کے نتھنوں میں خاک کا کوئی ذرہ چلا جائے۔ لیلیٰ تھی بھی تو خوبصورتی میں بے مثال مگر مہاراجہ کا اسے پانے کا جذبہ بھی اتنا ہی شدید تھا۔ اس گھوڑی کے حسن کا چرچا فارس اور افغانستان تک تھا۔ اس کے مالک پشاور کے حاکم یار محمد رنجیت سنگھ کے باجگزار تھے۔ وہ اس گھوڑی کے لیے شاہ ایران فتح علی خان قاچاری کی پچاس ہزار روپے نقد اور پچاس ہزار روپے سالانہ جاگیر اور سلطان روم کی پیشکش ٹھکرا چکے تھے۔ جب پشاور رنجیت سنگھ کے زیرنگیں ہوا تو انھیں لیلیٰ کا علم نہیں تھا مگر جب سنہ 1823 میں انھیں اس کی خبر ملی تو کنہیا لال کے مطابق وہ مجنون ہو گئے۔ رنجیت سنگھ نے گھوڑی کا اتا پتا لگانے کے لیے پوری جماعت تشکیل دے دی۔ کچھ نے کہا کہ گھوڑی پشاور میں ہے جب کہ دوسروں کے مطابق مہاراجہ کی دلچسپی کی خبر ملتے ہی اسے کابل منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس

اطلاع پر مہاراجہ نے اپنے خصوصی ایلچی فقیر عزیز الدین کو پشاور بھیجا۔ وہ واپسی پر تحائف میں کچھ اچھے گھوڑے ساتھ لائے لیکن لیلیٰ ان میں شامل نہیں تھی کیونکہ یار محمد نے رنجیت سنگھ کے ایلچی کو بتایا تھا کہ ان کے پاس وہ گھوڑی نہیں ہے۔ رنجیت سنگھ کو یقین تھا کہ یار محمد جھوٹ بول رہے ہیں۔ یار محمد کا 12 سالہ بیٹا مہاراجا کے دربار میں تھا۔ ایک بار اس نے مہاراجہ کے کسی گھوڑے کا تقابل لیلیٰ سے کیا۔ مہاراجہ نے پوچھا، مگر کیا لیلیٰ زندہ ہے تو لڑکے نے جواب دیا: ہاں بالکل۔ یار محمد نے اپنی گھوڑی رنجیت سنگھ کے حوالے کرنا منظور نہ کیا اور سید احمد بریلوی سے جا ملے جو اس وقت مہاراجہ سے برسرِ پیکار تھے۔ سنہ 1826 میں بدھ سنگھ سندھری والیا کی زیرِ قیادت ایک سکھ فوج سید احمد سے نمٹنے اور گھوڑی لینے کے لیے پشاور جا پہنچی۔ حکم تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، گھوڑی ہر قیمت پر لاہور دربار پہنچنی چاہیے۔ اس موقع پر ایک خونیں جنگ ہوئی جس میں ہزاروں افراد مارے گئے۔ بدھ سنگھ کو بھی یار محمد نے اور گھوڑے تحفے میں دیے مگر لیلیٰ کے بارے میں پھر بتایا کہ وہ تو مر چکی ہے۔ مگر رنجیت سنگھ کے جاسوسوں کی خبر تھی کہ گھوڑی زندہ ہے۔ مہاراجہ نے غصے میں شہزادہ کھڑک سنگھ کی قیادت میں ایک اور مہم بھیجی۔ فرانسیسی جرنیل وینٹورا جو پہلے نپولین کی فوج میں تھے اور اب مہاراجہ کے خاص معتمد بن چکے تھے، اس مہم کا اہم حصہ تھے لیکن ان کے پشاور پہنچنے سے پہلے ہی، یار محمد کو، بعض روایات کے مطابق، ان کے اپنے قبیلے نے گھوڑی پر لڑنے کے باعث ہلاک کر دیا۔ بعض دیگر روایات ان کے پہاڑوں میں روپوش ہونے کی بات کرتی ہیں۔ بہر حال ان کی جگہ ان کے بھائی سلطان محمد نے لے لی۔ اس مہم میں لاہور دربار نے فتح پائی۔ جب سلطان محمد سے جنرل وینٹورا نے لیلیٰ کا مطالبہ کیا تو انھیں بھی یہی بتایا گیا کہ لیلیٰ مر چکی ہے۔ تاہم وینٹورا نے نئے حکمران کو ان ہی کے محل میں پابند کر دیا اور آگاہ کیا کہ 24 گھنٹے کے اندر ان کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ تب جا کر سلطان محمد گھوڑی ان کے حوالے کرنے پر راضی ہوئے تاہم مورخین کے مطابق ایسا کرتے ہوئے وہ ایک بچے کی طرح بلک بلک کر روئے۔ پشاور سے گھوڑی کو فوری طور پر ایک خصوصی گاڑی میں 500 فوجیوں کی حفاظت میں لاہور روانہ کیا گیا۔ یہ بادامی باغ اور قلعے کے آس پاس ڈھلی ڈھلائی سڑکوں سے گزرتی مغربی اکبری دروازے پر لاہور پہنچی۔ یہ سنہ 1830 کا واقعہ ہے، گویا پہلی خبر سے پہلی جھلک تک کا سفر سات سال کا رہا۔ لیلیٰ کی آمد پر سکھ راجدھانی میں جشن کا سماں تھا کیونکہ مہاراجہ کے خواب کی ایک عرصے کے بعد تکمیل ہو رہی تھی۔ بقول سر لیپل ہنری گرفن کے رنجیت سنگھ نے جرمن سیاح بیرن چارلس ہیوگل کو خود بتایا کہ 60 لاکھ روپے اور 12 ہزار فوجی اس گھوڑی کو پانے میں کام آئے۔ ناول نگار اندو سندریسن لکھتی ہیں کہ رنجیت سنگھ کسی بھی گھوڑے پر بیٹھتے تو ان کی شخصیت کا تاثر ہی بدل جاتا۔ یوں لگتا کہ وہ اور جانور ایک ہو گئے ہیں۔ جب لیلیٰ کو مہاراجہ کے اصطبل میں لایا گیا تو وہ کچھ اڑیل سی تھی اور اپنے مضبوط، سفید دانت نکوس کر ملازموں کی طرف بڑھتی۔ رنجیت سنگھ نے اس پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا اور کان میں کچھ کہا کہ وہ ان کی مطیع ہو گئی۔ اس روز کے بعد لیلیٰ نے مہاراجہ کے علاوہ کم ہی کسی اور کو خود پر سوار ہونے دیا۔ لیلیٰ کو حاصل کر کے رنجیت سنگھ اتنے نہال تھے کہ انھوں نے 105 قیراط کا کوہ نور ہیرا جسے وہ اپنے بازو پر پہنتے تھے، لاکھوں روپے کے دیگر زیورات کے ساتھ گھوڑی کو پہنایا۔ ایسا اہتمام خاص مواقع پر بعد میں بھی ہوتا رہا۔ گلے میں ایسے چھلے پہنائے گئے جن پر قیمتی پتھر جڑے تھے۔ اس کی کاٹھی اور لگام بھی زروجواہر سے جگ مگ کرتی تھی۔ اس وقت کے سر برآوردہ شاعر قادر یار نے لیلیٰ کی تعریف میں نظم کہی اور مہاراجہ سے ڈھیروں انعام پایا۔ جنرل ونٹورا کو راجہ لانے پر دو ہزار کا قیمتی خلعت عطا ہوا جبکہ یار محمد کے بیٹے کو بھی آزاد کر دیا گیا۔

مہاراجا رنجیت سنگھ پر ایک کتاب کے مصنف کرتار سنگھ دگل کے مطابق مورخین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ لیلیٰ گھوڑی تھی یا یہ نام گھوڑے کا تھا۔ ان کا کہنا ہے نام سے تو یہ گھوڑی لگتی ہے مگر ساتھ ہی وہ ڈبلیو جی اوسبورن کے حوالے سے رنجیت سنگھ کی یہ بات نقل کرتے ہیں 'میں نے اس سے زیادہ مکمل جانور نہیں دیکھا۔ میں جتنا زیادہ لیلیٰ کو دیکھتا ہوں اتنا ہی زیادہ وہ مجھے شاندار اور ذہین لگتا ہے۔' چونکہ زیادہ روایات بشمول سر گرفن کے لیلیٰ کا بیان گھوڑی کے طور پر کرتی ہیں اس لیے یہاں ذکر مونث ہی کے طور پر ہے۔ سر گرفن کا کہنا ہے کہ سکھ ریکارڈز کے مطابق لیلیٰ گھوڑی تھی اور نام سے بھی ایسا ہی تاثر ملتا ہے۔ وہ لیلیٰ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس گھوڑے کے بعد کہ جو ٹرائے کے سقوط کا سبب بنا کوئی اور گھوڑا اتنی مصیبت اور اتنے بہادروں کی موت کا باعث نہیں بنا۔ اوسبورن کہتے ہیں کہ مہاراجہ کو اس بات کا بالکل دکھ نہیں تھا کہ انھوں نے ایک گھوڑے کو پانے کے لیے اتنی رقم اور اپنے لوگوں کی جانیں جھونک دیں۔ انھیں اس بات کا بھی افسوس نہیں تھا کہ اس سیدھی سیدھی لوٹ نے ان کے کردار کو کیسا داغدار کیا ہے۔ لیلیٰ مضبوط جسم، شاہ قد اور پھرتیلی تھی۔ ہیوگل نے یہ گھوڑی شاہی اصطبل میں دیکھی۔ وہ بیان کرتے ہیں 'یہ مہاراجہ کی بہترین گھوڑی ہے۔ گھٹنوں پر گول، گول سونے کی چوڑیاں ہیں، گہرا سرمئی رنگ ہے، سیاہ ٹانگیں ہیں، پورے سولہ ہاتھ قد ہے۔' ایمی ایڈن کا کہنا ہے کہ مہاراجہ کو لیلیٰ اتنی پسند تھی کہ بعض اوقات دھوپ میں بھی اس کی گردن سہلانے اور اس کی ٹانگیں دبوانے چلے جاتے۔ لیلیٰ کے کسی جنگ یا مہم میں استعمال کا پتا نہیں ملتا مگر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے یہ گھوڑی اور اپنی گھڑسواری کے کمالات سنہ 1831 میں روپڑ میں گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹینک کو دکھائے۔ انھوں نے انتہائی تیز رفتاری سے لیلیٰ کو بھگاتے ہوئے پانچ بار اپنے نیزے کی نوک سے پیتل کا ایک برتن اٹھایا۔ تماشائیوں نے بے پناہ داد دی تو مہاراجہ نے بڑھ کر لیلیٰ کا منہ چوم لیا۔ لیلیٰ کے لیے رنجیت سنگھ کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ مصنف کرتار سنگھ دگل کے مطابق

انھوں نے اپنے بیٹے شیر سنگھ کو لیلیٰ پر بغیر اجازت سواری کرنے کی پاداش میں قریب قریب عاق ہی کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد خاص فقیر عزیز الدین سے کہا کہ وہ شیر سنگھ کو جائیداد سے عاق کرنے جا رہے ہیں۔ فقیر نے جواب میں پنجابی میں کہا: جی ایہوای سزا بن دی اے۔ شیر سنگھ نے کیہ سمجھیا اے لیلیٰ اوہدے پیو دا مال اے؟ (بالکل یہی سزا بنتی ہے۔ شیر سنگھ نے کیا سمجھا ہے کہ لیلیٰ اس کے باپ کا مال ہے)۔ مہاراجہ یہ جواب سن کر ہنس پڑے اور شیر سنگھ کو معاف کر دیا۔ سر ولیم لی وارنر ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کیسے ایک ملاقات میں مہاراجہ نے گورنر جنرل کو دیگر گھوڑوں کے علاوہ لیلیٰ بھی دکھائی۔ مہاراجہ نے لیلیٰ کو تھوڑا چلانے پھرانے کے بعد ترنگ میں آ کر مہمان کو تحفے کے طور پر دینے کی پیش کش کی۔ گورنر جنرل کو لیلیٰ سے مہاراجہ کے عشق کا علم تھا اسی لیے انھوں نے پہلے تو یہ تحفہ قبول کیا اور پھر ایک اور لگام منگوا کر گھوڑی پر ڈال کر رنجیت سنگھ سے درخواست کی وہ اسے ان کی دوستی اور احترام کے ثبوت کے طور پر واپس قبول کر لیں۔ ولیم لی وارنر کے مطابق پھر لیلیٰ شاہی اصطبل کی طرف واپس جا رہی تھی اور مہاراجہ کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ رنجیت سنگھ پر فالج کا حملہ ہوا تو کہا جاتا ہے کہ جب انھیں لیلیٰ پر بٹھایا جاتا تو طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی اور یوں لگتا جیسے وہ بیمار ہیں ہی نہیں، اپنی جون میں لوٹ آتے۔ لیلیٰ ہی آخری گھوڑی تھی جس پر مہاراجہ سوار ہوئے۔

ولیم بار نے لیلیٰ کو اس کے آخری دنوں میں دیکھا۔ ان کا کہنا ہے 'ہمارا مقصد یہ تھا کہ اس گھوڑی کو دیکھا جائے کہ جسے پانے کے لیے مہاراجہ نے پیسے اور جانوں کی قربانی دی۔ جب اسے ہمارے سامنے لایا گیا تو ہمیں مایوسی ہوئی۔ اگر وہ اچھی حالت میں ہوتی تو خوبصورت لگتی۔ بہترین خوراک مگر کم ورزش کے باعث اس پر چربی چڑھ چکی تھی۔' لیلیٰ چاہے اپنی جوانی والی گھوڑی نہیں رہی تھی لیکن رنجیت سنگھ کی اس سے انسیت وہیں کی وہیں تھی اور لیلیٰ کے مرنے پر مہاراجہ اتنا روئے کہ چپ کروانا مشکل ہوا۔ لیلیٰ کو ریاستی اعزاز کے ساتھ اکیس توپوں کی سلامی میں دفن کیا گیا۔ مہاراجا کے بیٹے دلیپ سنگھ کی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نام بمبا تھا جو سدر لینڈ سے بیاہی گئیں۔ عمر کے آخری حصے میں بمبا برطانیہ سے لاہور منتقل ہو گئیں۔ وہ خود کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اکلوتی وارث سمجھتی تھیں اور ورثے میں انھیں رنجیت سنگھ کی بھس بھری گھوڑی لیلی اور اس کا ہیروں سے مزین ساز و سامان ملا۔ بمبا نے سنہ 1957 میں موت سے پہلے اپنا بیشتر ورثہ حکومتِ پاکستان کے سپرد کر دیا تاکہ اس کی دیکھ بھال کی جا سکے۔ مصنف مستنصر حسین تارڑ کے مطابق اسی دوران پراسرار طور پر لیلیٰ کا ہیروں سے مزین ساز و سامان چوری ہو گیا۔ تاہم لیلیٰ کا بھس بھرا وجود اور رنجیت سنگھ کے ساتھ اس تاریخی گھوڑی کی تصویر لاہور کے عجائب گھر کی سکھ گیلری میں موجود ہے اور دیکھنے والوں کو انسان اور جانور کی محبت کی کہانی سناتے ہیں۔

❁❁❁

مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب "سو عظیم شخصیات" کو لکھنے میں 28 سال کا عرصہ لگایا، اور جب اپنی تالیف کو مکمل کیا تو لندن میں ایک تقریب رونمائی منعقد کی جس میں اس نے اعلان کرنا تھا کہ تاریخ کی سب سے عظیم شخصیت کون ہے؟

جب وہ ڈائیس پر آیا تو کثیر تعداد نے سیٹیوں، شور اور احتجاج کے ذریعے اس کی بات کو کاٹنا چاہا، تاکہ وہ اپنی بات کو مکمل نہ کر سکے۔

پھر اس نے کہنا شروع کیا ایک آدمی چھوٹی سی بستی مکہ میں کھڑے ہر کر لوگوں سے کہتا ہے (میں اللہ کا رسول ہوں) میں اس لیے آیا ہوں تاکہ تمہارے اخلاق و عادات کو بہتر بنا سکوں، تو اس کی اس بات پر صرف 4 لوگ ایمان لائے جن میں اس کی بیوی، ایک دوست اور 2 بچے تھے۔

اب اس کو 1400 سو سال گزر چکے ہیں۔۔۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اب اس کے فالورز کی تعداد ڈیڑھ ارب سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور ہر آنے والے دن میں اس کے فالورز میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ شخص جھوٹا ہے کیونکہ 1400 سو سال جھوٹ کا زندہ رہنا محال ہے۔ اور کسی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ ڈیڑھ ارب لوگوں کو دھوکہ دے سکے۔

ہاں ایک بات ہے!

اتنا طویل زمانہ گزرنے کے بعد آج بھی لاکھوں لوگ ہمہ وقت اس کے ناموس کی خاطر اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ کیا ہے کوئی ایک بھی ایسا مسیحی یا یہودی جو اپنے نبی کی ناموس کی خاطر حتیٰ کہ اپنے رب کی خاطر جان قربان کرے؟

بلاشبہ تاریخ کی وہ عظیم شخصیت (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

اس کے بعد پورے ہال میں اس عظیم شخصیت اور سید البشر ﷺ کی ہیبت اور جلال میں خاموشی چھا گئی۔

❁❁❁

علامہ خادم کی وفات اور احمدی ڈاکٹر کا قتل: قومی سانحہ اور انسانی المیہ میں فرق

تحریر: سید مجاہد علی

تحریک لبیک پاکستان کے امیر علامہ خادم حسین رضوی 54 سال کی عمر میں اچانک انتقال کر گئے۔ کسی بھی شخص کی موت انسانی المیہ ہے۔ نہ اس پر شادیا نے بجائے جاسکتے ہیں اور نہ ہی سکھ کا سانس لیا جا سکتا۔ ہر شخص اپنی صوابدید اور ضرورت کے مطابق زندگی میں کردار ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خادم رضوی نے بھی یہی کیا۔ گزشتہ تین برس کے دوران اپنی تقریروں اور دھرنوں کے ذریعے انہوں نے اپنی پہچان بنائی۔ اب وہ اپنے رب کے حضور پیش ہیں۔ اپنے قول وفعل کے لئے خود ہی جوابدہ ہوں گے۔

پاکستان میں محبت ونفرت کے حوالے سے چونکہ ایک خاص مزاج بنایا جاچکا ہے، اس لئے ہر سانحہ یا وقوعہ پر شدید جذبات اور انتہائی رائے کا اظہار معمول بن چکا ہے۔ خادم رضوی کی وفات پر بھی ایسا ہی کچھ دیکھنے میں آرہا ہے۔ اس دوران آج ننکانہ کے ایک گاؤں میں ایک نوعمر لڑکے نے پستول سے مسلح ہو کر ایک احمدی خاندان کے گھر پر دستک دی۔ جواں سال ڈاکٹر نے دروازہ کھولا تو لڑکے نے کوئی بات کیے بغیر فائر کھول دیا۔ گولی کی آواز سن کر ڈاکٹر کے والد اور چچا باہر آئے تو حملہ آور نے انہیں بھی نشانے پر لے لیا۔ اہل محلہ نے لڑکے پر قابو پایا اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر خود زخموں سے جاں بر نہ ہوسکا۔ اس کے والد اور چچا زیر علاج ہیں۔ کوئی خبر نہیں کہ ان میں سے کس کی زندگی باقی ہے اور کس کا آخری وقت آنے کو ہے۔ پولیس نے البتہ تحقیقات شروع کردی ہیں۔ علامہ خادم رضوی کی رحلت کے ساتھ اس قتل کا ذکر دو حوالے سے ضروری ہے۔ ایک یہ خادم حسین نے جس مزاج کی آبیاری کرتے ہوئے شہرت حاصل کی، ننکانہ میں ہونے والا قتل اسی مزاج کا شاخسانہ ہے۔ اگرچہ ملک میں یہ بحث ہورہی ہے کہ خادم حسین کی موت قومی سانحہ ہے یا نہیں لیکن ایک احمدی ڈاکٹر کا قتل ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ قومی سانحہ کو ماپنے کا پیمانہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی ملک کا ایک نوجوان جب کسی دشمنی یا قضیہ کے بغیر محض عقیدہ کی وجہ سے مسلح ہو کر کسی دوسرے عقیدہ سے تعلق رکھنے والے خاندان کے گھر دستک دیتا ہے اور کسی سوال جواب کے بغیر فائر کھول کر ایک شخص کو ہلاک اور دو کو شدید زخمی کرتا ہے تو اس واقعہ کو ہر باشعور قومی سانحہ قرار دے گا۔ شعور ہمیں سوال کرنے اور دلیل دینے کا سبق دیتا ہے۔ اسی شعور کی بنیاد پر کوئی بھی قوم عقیدے کے نام پر ہونے والے قتل کو مسترد کرے گی اور اگر اس کے شہری ایسے کسی واقعہ میں ملوث ہوں تو اسے جرم اور سانحہ قرار دیا جائے گا۔ پاکستان میں اس روایت کو ترک کیا جارہا ہے۔ کیا یہ کہنے کا حوصلہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان سے شعور وآگہی کو سمیٹا جارہا ہے اور کسی کو احساس زیاں بھی نہیں ہے۔ کسی احمدی کا قتل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی عقیدہ ومسلک کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ لیکن ایسا ہر واقعہ اس یقین کو پختہ کرتا ہے کہ پاکستان میں دین کے نام پر جہالت اور شدت پسندی کو فروغ دینے کا کام زور شور سے ہورہا ہے۔ ان حالات کو بلاشبہ قومی سانحہ کہا جاسکتا ہے۔ ایسے واقعات کی شدت اور تسلسل زوال کا ایسا المناک سفر ہے جس پر گامزن ہونے والی کسی قوم نے فلاح اور زیست کا راستہ نہیں پایا۔ تباہی کے اس سفر سے بچنے کی کوئی صدا سننے میں نہیں آتی۔ لیکن علامہ خادم رضوی کے مداح ان کی رحلت کو قومی سانحہ سمجھنے پر اصرار کرتے رہیں گے۔ فیصلہ تاریخ کو کرنا ہے۔ تاریخ کے فیصلے تقریروں، نعروں اور ڈنڈوں کے زور پر نہیں ہوتے۔

ایک احمدی ڈاکٹر کے قتل کا ذکر علامہ خادم رضوی کی رحلت کے ساتھ کرنے کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ خادم رضوی نے 2016 میں اسی مذہبی شدت پسندی کا علم بلند کر کے قومی سیاست اور مباحث میں اپنی آمد کا اعلان کیا تھا جس کی آبیاری کی وجہ سے آج پاکستان میں ایک اقلیتی عقیدے سے تعلق رکھنے والے ایک انسان کا ناحق خون بہایا گیا ہے۔ فروری 2016 میں سپریم کورٹ کے حکم پر پنجاب کے سابق گورنر سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کو پھانسی سے پہلے خادم رضوی محکمہ

اوقاف کے ملازم کی حیثیت سے لاہور کی ایک مسجد میں خطیب تھے۔ اس وقت تک نہ کوئی انہیں قومی سطح کا مقرر مانتا تھا اور نہ ہی اہم دینی عالم قرار دیا جاتا تھا۔ خادم رضوی نے ممتاز قادری کی پھانسی پر سپریم کورٹ کے ججوں کو للکارنے اور اس فیصلہ کے خلاف احتجاج منظم کرنے سے شہرت پائی۔ اس کے بعد انتخابی حلف نامے میں ختم نبوت کے اقرار نامہ کی زبان کو عذر بنا کر نومبر 2017 میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت کے خلاف فیض آباد راولپنڈی میں تین ہفتے تک دھرنا سے مقبولیت کی نئی منازل تک رسائی حاصل کی۔

سلمان تاثیر کو ان کے سرکاری گارڈ ممتاز قادری نے جنوری 2011 میں قتل کیا تھا۔ وہ بھی ایک شدت پسند مولوی کی تقریر سن کر سلمان تاثیر کو توہین رسالت کا مرتکب سمجھنے لگا تھا۔ سلمان تاثیر کا واحد قصور یہ تھا کہ انہوں نے عیسائی خاتون آسیہ بی بی کو انصاف دلوانے کی بات کی تھی اور یہ سوال اٹھایا تھا کہ توہین مذہب کے ایسے قوانین کو کیوں تبدیل نہیں کیا جاسکتا جنہیں بے گناہ انسانوں کو نشانہ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سلمان تاثیر توہین مذہب کے پاکستانی قوانین پر مکالمہ تو شروع نہیں کروا سکے لیکن خود ہی ایک ایسے شخص کی گولیوں کا نشانہ بن گئے جنہیں سرکار نے ان کی حفاظت پر مامور کیا تھا۔ طویل انتظار اور قانونی مباحث کے بعد اکتوبر 2018 میں سپریم کورٹ نے آسیہ بی بی کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے رہا کرنے کا حکم دیا تھا۔ تحریک لبیک نے خادم رضوی کی قیادت میں اس فیصلہ کے خلاف بھی احتجاج کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک ملک کے سیاسی حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ (ن) کو اس کے انجام تک پہنچایا جا چکا تھا اور 'ایک پیج' کی نمائندگی کرتے ہوئے عمران خان وزیراعظم بن چکے تھے۔ خادم رضوی یہ اندازہ کرنے میں ناکام رہے کہ سیاسی منظر نامہ تبدیل ہونے سے اب ان کے ناجائز نعروں کی حوصلہ افزائی کا موسم نہیں تھا۔ آسیہ بی بی کیس میں احتجاج کرنے کی کوشش پر خادم رضوی سمیت تحریک لبیک کے درجنوں لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور طویل المدت سزائیں بھی دی گئیں۔ مرحوم خادم رضوی اور تحریک لبیک کے دیگر لیڈروں نے معافی نامے لکھ کر جان بخشی کروائی۔ علامہ خادم رضوی کے انتقال پر انہیں حرمت رسول ﷺ کا چوکیدار قرار دیتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے اور ان کے حامی سوشل میڈیا کے ذریعے اسے پاکستان ہی نہیں عالم اسلام کا ناقابل تلافی نقصان قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں ہے لیکن آزادی مذہب ورائے کا پرچار کرنے والے بیشتر لوگوں نے خادم رضوی کے انتقال پر افسوس کا اظہار ضرور کیا ہے کہ کسی بھی انسان کی موت المیہ ہوتا ہے لیکن ان کے خلاف کوئی بیان جاری نہیں کیا گیا۔ یہ ایک جائز اور مناسب طرز عمل ہے۔

کسی شخص کے ساتھ اختلاف اس کی زندگی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ کسی کے انتقال کے بعد اسے برا بھلا کہنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ علامہ خادم رضوی نے عبدالستار ایدھی اور انسانی حقوق کی نامور علمبردار عاصمہ جہانگیر کے مرنے پر جن خیالات کا اظہار کیا، وہ بھی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ وہ جس سوچ کی نمائندگی کرتے تھے، اس کے مطابق نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر کسی کو مرنے کے بعد بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ خادم رضوی کی رحلت پر اگر کچھ عناصر سوشل میڈیا پر ان کے خیالات کی وجہ سے منفی تبصرے سامنے لا رہے ہیں تو اس کی دلیل خود مرحوم کے قول و فعل میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ علامہ خادم رضوی کے دینی علم اور تحقیقی کام کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں۔ انہوں نے اپنے جاں نثاروں کے لئے تقریروں کی صورت میں ورثہ چھوڑا ہے۔ ان میں وہ محتاط روی کی تمام حدود پھلانگتے ہیں اور دشنام طرازی کو تکیہ کلام بنانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ ان کے طرز تکلم ہی کی وجہ سے انہیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تحریک لبیک میں اب کوئی دوسرا لیڈر ان کی جگہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔ تقریروں اور مذہبی سیاست کے نام پر دیے گئے دھرنوں کی بنیاد پر کسی مذہبی یا سیاسی لیڈر کے علمی مقام کا تعین ممکن نہیں۔ ان کا آخری دھرنا گزشتہ اتوار اور سوموار کو گستاخانہ خاکوں کے تنازعہ پر فرانس کے سفیر کو پاکستان سے نکالنے کے سوال پر دیا گیا تھا۔ تاہم چند گھنٹے تک وفاقی وزیر مذہبی امور اور وزیر داخلہ کے ساتھ مذاکرات کے بعد یہ دھرنا ایک ایسے 'معاہدے' کی بنیاد پر اختتام پذیر ہوا تھا جس کی قانونی حیثیت کو پیر نور الحق قادری بھی مسترد کر چکے ہیں۔

کسی بھی شخص کے انتقال کے بعد اس کے خیالات پر تو بات کی جاسکتی ہے لیکن اس کی نیت پر رائے دینا مناسب نہیں ہوتا۔ البتہ یہ معاملات ریکارڈ کا حصہ ہیں کہ خادم رضوی کی قیادت میں کب اور کیوں دھرنے دیے گئے اور کس طرح ان کا خاتمہ ہوا۔ ماضی قریب کی اس تاریخ کا مطالعہ کر کے ہر شخص اپنی رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ علامہ خادم رضوی کے انتقال کے اگلے ہی روز ایک احمدی خاندان پر جان لیوا حملہ البتہ یہ واضح کرتا ہے کہ تحریک لبیک اور اس کے داعی جس مذہبی انتہا پسندی کو ملک میں مروج کرنے کے درپے ہیں، وہ امن وفلاح کا راستہ نہیں ہے۔ یہ طرز عمل پاکستان کو دنیا میں بھی تنہا کرے گا اور قومی سطح پر انتشار، تشدد اور تصادم کا سبب بھی بنے گا۔

❁❁❁

بھکاری

تحریر: آدم شیر

وہ بھکاری نہیں تھا، کم از کم مجھے تو نہیں لگتا تھا۔ اُس کی میلی چادر میں کئی راہ گیر بھیک ڈال دیتے لیکن وہ بھکاری نہیں تھا۔ میں روز اُسے ایک موڑ پر جھولی پھیلائے بیٹھا دیکھتا۔ وہ کوئی صدا نہیں لگاتا تھا۔ اِسی جگہ کئی بھکاری اِشارے پر رُکنے والی گاڑیوں کے گرد منڈلاتے تو اُن کی الگ الگ صدائیں ہر کسی کو متوجہ کرتیں لیکن وہ خاموشی کے ساتھ آسمان تکتا رہتا۔ مَیں نے اُسے ہمیشہ دن کے وقت دیکھا تھا، اس لیے وہ تارے تو نہیں گنتا تھا، پھر پتا نہیں کیا ڈھونڈتا تھا۔ اِس چوک میں کافی رش ہوتا ہے اور شور بھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ گاڑیوں کی پاں، پاں، ٹی، ٹی۔۔۔ رکشہ والوں کی آوازیں۔۔۔ اِدھر آؤ جی، کدھر جانا ہے؟ وہ سب چیزوں سے بے پرواہ دِکھائی دیتا تھا، خالی نظروں سے اوپر دیکھتا ہوا۔۔۔ اور لوگ اُس کی جھولی میں خیرات پھینکتے جاتے تھے۔ مَیں دفتر جاتے ہوئے جب اِس اشارے پر ڈیڑھ منٹ کے لیے رکتا تو کار میں بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا اور کبھی اُس کی نظر بھی پڑ جاتی تھی۔ وُہ شاید نہاتا نہیں تھا۔ بال آپس میں یوں چپکے ہوئے تھے جیسے رسی بنانا چاہ رہے ہوں۔ ماتھا کشادہ تھا جس پر وقت نے تین چار سِلوٹیں ڈال دی تھیں۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں اکا دُکا سرخ لکیریں بھی تھیں جو محنت کشوں کی خاص نشانی ہوتی ہیں۔

اُس کی آنکھیں دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ وہ بھکاری نہیں۔ اُس کی آنکھوں میں شرمندگی کی لہریں بھی تھیں، خبر نہیں کس بات کی، بھکاری پن کی یا کسی اور بات کی۔۔۔ ناک کے ساتھ دائیں گال پر ایک نشان تھا جو کسی پُرانے زخم کی یادگار لگتا تھا۔ نشان بظاہر چھوٹا تھا کہ اِس کا بڑا حصہ ڈاڑھی نے چھپا رکھا تھا جو اُس کے لباس کی طرح بے ترتیب اور میل سے اَٹی ہوئی تھی اور معلوم دیتا کہ کبھی اُسترے کی زد میں نہیں آئی تھی۔ موچھیں تو ایسی تھیں جیسے حجام کی دکان سے کٹے بال پکڑ کر کسی نے گوند سے آڑے ترچھے چپکا دیے ہوں۔ گردن پر ایک اور نشان تھا جو گال والے نشان سے زیادہ بڑا تھا۔ پٹھانوں کے رنگ گورے ہوتے ہیں سو اُس کا بھی تھا لیکن میل کی تہہ در تہہ چادر نے مَری چھپکلی سا کر دیا تھا۔ نہیں جانتا کہ اُس کی عمر کتنی تھی لیکن بڑھاپے میں داخل ہوئے کافی وقت بیت چکا تھا۔ معلوم پڑتا کہ کبھی بڑا گھبرو تھا، جس گلی سے گزرتا ہوگا اِس میں کئی کھڑکیاں اُس کے لیے ضرور کھلتی ہوں گی۔ اُس کے ہاتھوں کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور نشہ کرنے والوں کی بھی ایسی ہی ہوتی ہیں مگر وہ نشئی تھا نہ دمے کا مریض تھا۔ اُس کی رگیں تو ہل کھینچنے والے کسانوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ اُس کے ہاتھ دیکھ کر لگتا تھا کہ اِنھوں نے کبھی لاتعداد پتھر پاش پاش کیے ہوں گے۔ اب تو وہ بھکاری لگتا تھا گو بھکاری نہیں تھا۔ وہ بس بیٹھا رہتا اور لوگ اُس کے پاس فالتو پیسے پھینک کر آگے بڑھ جاتے۔ اُسے ہر بار دیکھ کر یہی محسوس ہوتا کہ ایک زبردست کہانی مل جائے گی۔ اُس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر روز یہی سوچ کر گزر جاتا کہ کل بات کروں گا اور وُہ کل بھی ایک دن آ ہی گئی۔ اُس روز سحری سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ دفتر جانا نہیں چاہتا تھا مگر میکانکی انداز میں جا رہا تھا۔ اِشارے پر کار روکی تو وہ حسبِ معمول آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں اَن گنت سوراخ ہو گئے تھے، آنسوؤں جیسا نمکین پانی قطرہ قطرہ گر رہا تھا اور وُہ بھیگ رہا تھا۔ لوگ سروں پر چھاتے تانے آ جا رہے تھے۔ جو چھتری نہیں خرید سکتے تھے وہ خود کو کوستے جا رہے تھے۔ چند راہ گیر دُکانوں اور کچھ عمارتوں کے سایوں میں کھڑے بارش کے رُکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ سائیکل اور موٹر سائیکل پر آنے جانے والوں کی شامت آئی ہوئی تھی۔ مجھ ایسے گاڑیوں میں بیٹھے اُن پر چھینٹے اڑاتے ہوئے گنگناتے جا رہے تھے لیکن وہ بھیگ رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا کانپ بھی رہا تھا۔ وہیں پاس ہی، کئی بھکاری بلند و بالا عمارت کے بڑھے ہوئے چھجے کے نیچے کھڑے تھے لیکن وہ سارے ماحول سے لاتعلق اپنی جگہ پر بیٹھا بھیگ رہا تھا۔

اُس دن رِم جھم پڑتی پھوار سارا دن نہ رُکی۔ ایسی جھڑی لگی کہ کئی فصلیں ہری ہوئیں اور کئی ایک بہہ گئیں۔ دفتر سے واپسی پر مَیں اُسی اشارے پر رکا تو اُسے کچے مکان کی چھت کی طرح زمین پر گرا دیکھا، نجانے کب سے بے سُدھ پڑا تھا اور لوگ آ جا رہے تھے۔ مَیں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ اُسے بڑی مشکل سے دو راہ گیروں کی مدد لے کر گاڑی میں لٹایا اور نزدیکی سرکاری ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے ایسے ہی دیکھا جیسے ایسوں کو دیکھا جاتا ہے۔ پھر وہ زیرِ تربیت خاتون سے محوِ گفتگو ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے یاد دلایا کہ بھائی میاں ابھی کسی کو تیری ضرورت ہے۔ ’’آپ اُس کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ مجھے تو وہ بھکاری لگتا ہے۔ دوائیاں لکھ دی ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ ڈاکٹر نے بے زاری سے کہا جس پر میں یہی کہہ سکا۔

’’وہ بھکاری نہیں۔‘‘

اور دو تین بڑوں سے رابطے کیے اور لاغر بوڑھے کو مسیحائی مل گئی۔ بیوی جھگڑ کر میکے گئی ہوئی تھی لہٰذا میں آزاد تھا تو اُسے گھر لے آیا کہ ایک زبردست کہانی مل جائے گی۔ دفتر سے چھٹیاں لیں، چار پانچ فلم خریدے، خشک میوہ جات لایا اور اسے کھلایا، پلایا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ مجھے فرشتہ سمجھنے لگا۔ مَیں نے اُس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ پھر میں نے ذرا اور واضح انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ پھر بھی نہ مانا جس پر میں نے کھلم کھلا کہا:

’’مجھے صرف آپ کی کہانی سے دل چسپی ہے۔‘‘

لیکن وہ طوطے کی طرح ایک ہی جواب دیتا کہ میرے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ میں اس تکرار سے بے زار ہوگیا۔ ’’آپ اپنی کہانی سنائیں۔ یہی میرے احسان کا بدلہ ہے۔‘‘ اُس نے عجیب نظروں سے دیکھا اور بولا۔

’’میں وزیرستان ایجنسی میں پیدا ہوا۔ وہیں پلا بڑھا۔ اپنے قبیلہ کی ایک خوبرو لڑکی سے شادی کی۔ اللہ پاک نے مجھے چار بچے دیے، تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ جب بچے پیدا ہوئے تو پڑوسی ملک میں روس کے خلاف جنگ جاری تھی۔ جب جوان ہوئے تو امریکی سرکار دہشت گردی کے خلاف لڑ رہی تھی۔ اخباروں میں پڑھا اور ٹی وی پر دیکھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنگ دہشت گردی کے نہیں، اسلام کے خلاف تھی۔ بہرحال لوگ کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں حالانکہ لوگوں کو خود کچھ پتا ہوتا نہیں۔

جنگ جاری تھی، جنگیں ہر دور میں جاری رہتی ہیں، کچھ کو ہر وقت جنگ کی ضرورت ہوتی ہے اور امریکہ انھی میں سے ایک ہے۔ اِسی ضرورت کے تحت عراق میں جنگ شروع ہوئی تھی جو افغانستان سے ہوتی ہوئی پاکستان پہنچ چکی تھی جس نے پہلے وزیرستان میں ڈیرا ڈالا۔ یہاں کارروائیاں امریکی نہیں، ہماری فوج کر رہی تھی۔ طالبان بھی لڑ رہے تھے۔ پتا نہیں کون جیت رہا تھا۔ کون ہار رہا تھا۔ کون نشانہ بن رہا تھا اور کون بنا رہا تھا۔ فوجی مر رہے تھے یا طالبان۔۔۔ لاشیں انسانوں کی ہی گر رہی تھیں۔ لاشیں عراق میں بھی گر رہی تھیں اور افغانستان بھی بچا نہیں تھا نہ میرا وزیرستان اس وبا سے محفوظ رہ سکا تھا۔ تب لوگ ہجرت کرنے لگے اور اس کی قوت نہ رکھنے والے مرنے لگے۔ کوئی اپنوں کی گولیوں کا نشانہ بنتا اور کسی کو غیروں کے میزائل مار دیتے۔ کوئی مرنے والوں کو شہید کہتا اور کوئی جہنم واصل گردانتا۔ کئی مارنے والوں کو طالبان کہتے، جہادی کہنے والے بھی کم نہ تھے، اور کوئی انھیں امریکہ کے پٹھو ٹھہراتا لیکن لوگ مرتے رہے۔

میرے گھر پر بھی ایک میزائل گرا۔ میرے دو جوان بیٹے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئے۔ میرے ایک بیٹے کے چیتھڑے میرے ہی مکان میں بکھرے تھے۔ دوسرے بیٹے کا جسم چھلنی بن گیا تھا۔ میری بیٹی کے سر سے نکلنے والا لہو کپڑے رنگین کر گیا البتہ وہ زندہ تھی اور میرے گال سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ ہم ڈاکٹروں کے چکر سے نکلے تو چند ماہ بعد میرا سب سے چھوٹا بیٹا غائب ہوگیا۔ اُن دنوں بڑے لوگ لاپتا ہوئے تھے۔ غائب کرنے والے کا کسی کو پتا تھا نہ یہ معلوم ہوتا کہ لاپتہ شخص زندہ ہے یا مردہ۔۔۔ مجھے بھی اپنے بیٹے کا کچھ پتا نہ تھا۔ کوئی کہتا، میرا بیٹا امریکہ لے گیا ہے۔ کبھی خبر ملتی، وہ انتقام لینے کے لیے طالبان سے مل گیا ہے۔ کسی نے کہا، میرا بیٹا پاکستان میں ہی ہے لیکن پتا نہیں کس کے پاس تھا۔ میرا دل کہتا تھا۔۔۔ وہ زندہ ہے۔۔۔ لیکن میری بیوی کا دماغ تھوڑا تھوڑا چل گیا تھا۔ پختونوں کے لیے انتقام نہ لینا اُتنا ہی شرمناک ہے جتنا کسی کی بیوی کا دوسرے مرد کے ساتھ سونا اور برہنہ پکڑے جانا۔ میری بیٹی جوان تھی۔ بیوی ہوش کھو چکی تھی۔ پھر بھی انتقام لیتا تو کس سے لیتا؟ اُن دنوں کسی کو دشمن کا علم نہیں تھا اور جن کو پتا تھا، وہ بتاتے نہیں تھے۔ میں نے گھر بار بیچا، بیوی اور بیٹی کو ساتھ لیا اور رشتہ داروں کے پاس پناہ لینے لاہور کے لیے نکل پڑا۔ میری قسمت خراب تھی یا حالات ہی ایسے بنا دیے گئے تھے کہ جب ہم لاہور کے لاری اڈے پر اترے تو زوردار دھماکہ ہوگیا جس نے میری بیٹی اور بیوی چھین لی۔ اس بار میری گردن پر بھی نشان پڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب انتقام لینا ضروری ہوگیا ہے لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ وہی دشمن کی پہچان کا مسئلہ۔۔۔ ویسے بھی مجھے اپنے چھوٹے بیٹے کا انتظار تھا، ایک وہی تو اپنا بچا تھا۔ یہ انتظار بھی ایک دن ختم ہوگیا۔ ٹی وی پر خبر چلی کہ امریکہ کی عدالت نے طالبان کے ساتھی ایک پاکستانی کو سزائے موت سنا دی ہے۔ وہ پاکستانی میرا بیٹا تھا۔‘‘

بوڑھا خاموش ہوا تو مَیں نے لمبی سانس لی اور کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی گردن جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں ہتھیلیوں پر جمی ہوئی تھیں جنھیں وہ رگڑ رگڑ کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ مَیں زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا اور اُس کے گال بھگوتی آنکھوں میں موجود پیغام سمجھنے کے بجائے بولا۔

’’تو کیا آپ کا بیٹا واقعی طالبان کا ساتھی تھا؟‘‘

اس نے چند لمحوں کے لیے نظریں مجھ سے ملائیں۔ پھر کمرے میں اِدھر اُدھر بکھری چیزیں دیکھ کر بولا، ’’نہیں۔ وہ تو پشاور کے ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ میرے گھر میں دو لوگ ہی تو پڑھے لکھے تھے۔ ایک میں اور دوسرا وہ۔۔۔ میرا پیارا بچہ۔‘‘

’’پھر آپ کا بیٹا امریکہ کیسے پہنچ گیا؟‘‘

’’یہ تو امریکہ جانتا ہے یا پاکستان۔۔۔ یا پھر وہ۔۔۔‘‘ اس نے بے بسی کے ساتھ چھت کو دیکھتے، ہاتھوں سے ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے جواب دیا تو مَیں نے طالبان کو خوب برا بھلا کہا اور بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

’’طالبان نہ آتے تو قبائیلوں پر قیامت بھی نہ ٹوٹتی۔‘‘

’’کون طالبان؟‘‘

’’جگہ جگہ دھماکے کرنے والے دہشت گرد۔۔۔ آپ کی بیوی اور بیٹی کو مارنے والے۔۔۔‘‘

’’تو ان کو مارو۔‘‘

’’ان کو ہی مارا جا رہا ہے۔‘‘

’’مجھے تو وہی مرتے نظر آتے ہیں جو صدیوں سے وہاں رہ رہے ہیں۔ اب پتا نہیں کس نے انھیں دہشت گرد بنا دیا۔ نسلیں تباہ کر دیں۔‘‘

اِس پر میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا کہ ہر کسی کا زاویۂ نگاہ مختلف ہوتا ہے اور مَیں تھک بھی گیا تھا۔ اگرچہ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے مگر سوچ کو گھوڑے دوڑانے کے لیے ہموار راستہ نہیں مل رہا تھا۔ یوں بھی کہانی سنتے سنتے رات گزر چکی تھی۔ سویرا ہونے کو تھا۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل کر چہچہا رہی تھیں۔ دور کہیں مؤذن بھی اذان دے رہا تھا۔ اس سے پہلے پہرے دار کی سیٹی بھی سنائی دی تھی لیکن کمرے میں سناٹا تھا۔

❀❀❀

شعبہ انٹرنیشنل

'مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دور مذہبی مساوات کا نمونہ'

تحریر: جسپال سنگھ

ایک بار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے وزیر خارجہ فقیر عزیز الدین سے کہا رب چاہتا ہے کہ میں ہر مذہب کو ایک نظر سے دیکھوں اس لیے رب نے مجھے صرف ایک آنکھ ہی دی ہے

فقیر عزیز الدین اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اس بات چیت کا ذکر کرتار سنگھ دوگل کی کتاب (رنجیت سنگھ، دی لاسٹ ٹو لے آرمز) (Maharaja Ranjit Singh: The Last to Lay Arms) میں کیا گیا ہے۔

فقیر عزیز الدین کی طرح کئی اور مسلمان مہاراجہ رنجیت کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے جنھیں ان کے مذہب کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ان عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت خود ایک پکے سکھ تھے اور ان کا عقیدہ گرو گرنتھ صاحب پر تھا۔ کرتار سنگھ دوگل کے مطابق جنگ کے میدان میں بھی گرو گرنتھ کو ایک ہاتھی پر لاد کر لے جایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ کا رجحان کسی ایک مذہب کی طرف نہیں دیکھا گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے بی بی سی کی طرف سے تاریخ دانوں سے بات چیت کی گئی۔ آج ان کے یوم پیدائش کے موقع پر پیش ہے یہ رپورٹ۔

گرو نانک کے فلسفے پر بنائی گئی ریاست

پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے ریٹائر ہونے والی تاریخ دان پروفیسر اندو بانگا سے بی بی سی نے مذہبی برابری اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں بات چیت کی۔ پروفیسر اندو بانگا نے بتایا: بھارت میں سیکولرازم کی تعریف تمام مذاہب کا احترام ہے۔ بھارت کی تاریخ میں سیکولرازم کی بہترین مثال مہاراجہ رنجیت سنگھ ہیں۔ وہ خود ایک پکے سکھ تھے لیکن انھوں نے اپنی حکومت، فوج اور اپنے رویے میں مذہب کو کبھی رکاوٹ نہیں بننے دیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت بابا گرو نانک کے فلسفے پر چلائی جاتی تھی۔ بابا گرو نانک کے فلسفے کا سب سے اہم جزء سماجی مساوات اور مذہبی آزادی تھا۔ سماجی مساوات کا اثر رنجیت سنگھ کی حکومت اور ان کی فوج میں صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

ہندو مسلمان افسر

بات چیت میں اندو بانگا نے کئی ہندو اور مسلمان افسروں کے نام بتائے۔ انھوں نے بتایا کہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ہندو، مسلمان افسر بھی تھے۔ مہاراجہ رنجیت کے دربار میں مختلف اوقات میں تقریباً ساٹھ یورپی لوگوں نے بھی اہم ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ اندو بانگا نے بتایا کہ ہندوؤں میں دیوان محکم چند اور مصل دیوان چند فوج میں جرنیل تھے۔ دیوان بھوانی داس اور دینا ناتھ حساب کتاب دیکھتے تھے۔

مصر بیلی رام خزانے سے متعلق کام پر مامور تھے۔ مسلمانوں میں خاص نام عزیز الدین، نور الدین، امام الدین اور ان کی اولادیں ہیں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ جالندھر اور دوابا کے گورنر محی الدین، جنرل سلطان محمود، اور کئی اور مسلمان رنجیت کے دور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ کرتار سنگھ دوگل اپنی کتاب (رنجیت سنگھ، دی لاسٹ ٹو لے آرمز) میں لکھتے ہیں کہ فقیر امام الدین کو امرتسر کے گوبند گڑھ قلعے اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کی ذمہ داری دی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی امام الدین امرتسر میں اسلحہ کے ذخیرے اور شاہی اصطبل کے بھی انچارج تھے۔ کئی جنگی مہموں پر امام الدین کو بھیجا گیا تھا۔ امرتسر جیسے سکھ مذہب سے جڑے اہم شہر کے اہم قلعے کی ذمہ داری دے کر مہاراجہ نے واضح کر دیا تھا کہ وہ مذہب کے حوالے سے کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔

شریعت اور شاستر برابر

اندو بانگا نے بتایا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے نظام انصاف میں شریعت اور شاستر دونوں کو برابری کا درجہ حاصل تھا۔ اگر کسی مسلمان کا مقدمہ ہوتا تو اس کے ساتھ شریعت کی روشنی میں فیصلہ ہوتا جب کہ ہندوؤں کے معاملات میں شاستر کا استعمال ہوتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی جائیداد سے متعلق تمام فیصلے شریعت کے حساب سے کیے جاتے تھے۔ کرتار سنگھ دوگل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: مہاراجہ جب حکومت میں آئے تو سکھ اکال تخت صاحب پر اکٹھا ہو کر فیصلے کرتے تھے جنھیں گرمت کہا جاتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سروت خالصہ کی جگہ وزیروں کی کابینہ کو دی اور تمام فیصلے ان کی جانب سے لیے جانے لگے۔

مذہبی وظائف کا نیا ریکارڈ

اندو بانگا کے مطابق مہاراجہ رنجیت کے مذہبی مساوات کے اونچے معیار کا مختلف

مذاہب کے وظائف سے پتا چلتا ہے جو بھارتی روایت کا اہم حصہ رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مغلوں کے وقت بھی مذہبی وظائف دیے جاتے تھے۔ اس سے پہلے راجہ ہشوردن کے وقت بھی ایسے مذہبی وظائف دیئے جاتے تھےلیکن رنجیت سنگھ کے دور میں جو کچھ ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اپنی حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے جتنے پرانے وظائف مقرر تھے انھیں بحال کیا گیا اور اس کے علاوہ رنجیت سنگھ نے اپنے طرف سے نئے وظائف جاری کیے۔ اندو بانگا مانتی ہیں کہ رنجیت سنگھ کے دور میں مالیہ کا جو حصہ مذہبی وظائف کی مد میں دیا جاتا تھا وہ مغل بادشاہ اکبر کی طرف سے دیئے جانے والے وظائف سے بھی زیادہ تھا۔ رنجیت سنگھ نے مندروں کو جاگیریں دیں جیسے جوالا دیوی کا مندر کا چھتر مہاراجہ رنجیت کے والد مہاسنگھ کی طرف سے لگایا گیا تھا اور بعد میں رنجیت سنگھ نے بھی مندروں کو اور وظائف دیئے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے خانقاہوں، پیروں کی درگاہوں اور صوفیوں کو بھی وظیفے دیئے گئے۔ اگر مہاراجہ سفر پر جایا کرتے تھے تو اس علاقے کے سب سے اہم مذہبی مقام ضرور جایا کرتے تھے۔

دشمنوں کا احترام

اندو بانگا کے مطابق رنجیت سنگھ نے جہاں جہاں بھی جنگی مہمیں بھیجیں، جس کو بھی ہرایا، اس کو راستے میں نہیں چھوڑا۔ رنجیت سنگھ کی طرف سے ہارے ہوئے بادشاہ کو حکومت کا حصہ بننے یا جاگیر کی پیشکش کی جاتی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملتان کے صوبیدار مظفر خان کو بھی یہی پیش کش کی تھی۔ ایسی پیشکش کرتے وقت مذہب کو کبھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ کتاب (ملٹری آفیئرز آف مہاراجہ رنجیت سنگھ) میں مہاراجہ رنجیت کی طرف سے ایک ہی افسر کو دیئے گئے چار سو سے زیادہ احکامات کی تفصیل موجود ہے۔ اس کتاب کو اندو بانگا اور جے ایس گریول نے ادارت کی ہے۔ اس کتاب میں دیئے گئے احکامات کا ذکر کرتے ہوئے اندو بانگا کہتی ہیں: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے اپنے افسروں کو ہدایت دی جاتی تھی کہ فوجی مہم کے دوران عام لوگوں کو کوئی مشکل نہ ہو۔ کسانوں سے زبردستی کچھ نہ لیا جائے اور اگر لیا جائے تو اس کی پوری قیمت ادا کی جائے۔ ان احکامات سے پتا چلتا ہے کہ فوج کے لیے ساری عوام ایک برابر تھی۔ اندو بانگا کے مطابق سکھ صرف آبادی کا دس فیصد تھے اور زیادہ آبادی والے دوسرے مذاہب کو اگر سکھ راج قبول نہ ہوتا تو ان پر حکومت نہیں ہوسکتی تھی، اور اگر انھیں دبانے کی کوشش کی جاتی تو بغاوت کے بھی امکانات پیدا ہوسکتے تھے۔ ان کے مطابق اس بات کے پختہ ثبوت موجود ہیں کہ اس وقت کوئی بڑی بغاوت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پنجاب سے لوگوں نے ہجرت نہیں کی بلکہ باہر سے آکر لوگ پنجاب میں بسے تھے۔

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے"، لاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات ورسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کرواسکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔
ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

پاکستان امریکی دوستی کے کیسینو میں کیسے داخل ہوا؟

شعبہ انٹرنیشنل

تحریر: ابونائل

میں ایک مرتب ملائیشیا گیا تھا۔لٹانے کے لئے پیسے تو نہیں تھے لیکن یہ شوق چرآیا کہ یہاں ایشیا کا ایک بہت بڑا کیسینو ہے اسے دیکھنا تو چاہیے۔ کوالا لامپور سے بس میں بیٹھ کر جینٹنگ ہائی لینڈ روانہ ہوئے۔ یہ نہایت خوبصورت پہاڑی علاقہ تھا۔بس تیزی سے سفر کرتی ہوئی کیسینو کے اندر داخل ہوئی اور ہمیں عمارت کے اندر اتار دیا۔ چائے پی کر خیال آیا کہ باہر چہل قدمی کرتے ہیں۔ایک راستے پر چل پڑے جو بظاہر عمارت سے باہر جا رہا تھا۔لیکن کچھ دیر میں اس کیسینو کے ایک اور حصہ میں پہنچ گئے جہاں دلچسپی کا ایک اور سامان لوگوں کو اپنی کمائی لٹانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ بار بار نکلنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ یہ راہداریاں کیسینو کے کسی اور حصے پر اختتام پذیر ہو جاتیں۔ پاکستان اور امریکہ کی دوستی اس عمارت کی طرح ہے ہم اس میں داخل تو ہو گئے ہیں لیکن ہر مرتبہ باہر نکلنے کا راستہ ایک اور خام امید پر ختم ہوتا ہے۔ یہ سطور لکھتے وقت تک امریکہ کے انتخابات کا فیصلہ کن نتیجہ تو سامنے نہیں آیا۔ لیکن آثار یہی ہیں کہ جو بائڈن امریکہ کے اگلے صدر ہوں گے۔

جب بھی وائٹ ہاؤس میں کوئی نیا صدر داخل ہو بہت سے پاکستانی کچھ رومانوی خیالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گویا امریکہ کے صدر کی تبدیلی کے ساتھ ہماری قسمت بھی بدل جائے گی۔ ہماری اس خوش فہمی نے بار بار ہمارے قومی المیوں کو جنم دیا ہے لیکن ابھی تک ہماری ثابت قدمی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ جو بھی صاحب صدر کا منصب سنبھالیں گے یقینی طور پر ان کی ترجیحات میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنا بالکل نہیں ہوگا۔ وہ یقینی طور پر پاکستان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس غرض کے لئے کبھی کسی وزیر اعظم کو وائٹ ہاؤس میں چائے کافی پلا دی جائے گی یا اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک دو تصویریں کھنچوالی جائیں گی۔ اور پاکستان میں ایک شور مچ جائے گا کہ امریکہ نے ہماری اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب دن پھر گئے۔ اس کالم میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ آزادی کے بعد پاکستان امریکہ کے کیمپ میں کس طرح پہنچا؟

جب پاکستان معرض وجود میں آیا اور اقوام متحدہ کا ممبر بنا تو اس وقت اقوام متحدہ میں فلسطین کا مسئلہ پیش ہوا۔ امریکہ اور اس کے اتحادی اسرائیل کے قیام کی حمایت کر رہے تھے۔ پاکستان نہ صرف اس کی مخالفت کر رہا تھا بلکہ پاکستان کے وزیر خارجہ اس سب کمیٹی کے صدر تھے جو کہ فلسطینیوں کی حمایت میں تجاویز مرتب کر رہی تھی۔

بہر حال جب ہندوستان نے پاکستان کو اس کے حصے کے اثاثوں کی منتقلی میں رکاوٹیں ڈالنی شروع کیں تو اس سے پاکستان کی حالت مزید پتلی ہو گئی۔ آغاز میں ہی پاکستان نے امریکہ سے دو بلین ڈالر کی عسکری اور سولین مدد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد 1949 میں وزیر اعظم لیاقت علی خان صاحب کا امریکہ کا دورہ ایک سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ اور پاکستان کی طرف سے یہ پہلو بار بار زور دے کر بیان کیا جاتا رہا کہ پاکستان کمیونسٹ یلغار کے سامنے ایک دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیاقت علی خان صاحب کے دورے کے بعد بھی یہ حالت تھی کہ جب امریکہ نے کوریا میں جنگ کے لئے فوج کے حصول کی کوشش کی تو پاکستان نے اپنی ضروریات کا حوالہ دے کر یہ سہولت مہیا نہیں کی۔ جولائی 1952 میں پاکستان نے امریکہ سے کچھ اسلحہ خریدنے کی کوشش کی لیکن امریکہ نے یہ اسلحہ مہیا کرنے سے انکار کر دیا۔ 1954 کے آغاز تک امریکہ نے پاکستان سے زیادہ اسلحہ بھارت کو فروخت کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اب تک پاکستان امریکی اتحادیوں کے کیسینو میں داخل نہیں ہوا تھا۔

(100-Crossed Swords by Shuja Nawaz p 93)

یہ صورت حال اس وقت تبدیل ہونی شروع ہوئی جب جنوب مشرقی ایشیا میں مغربی طاقتوں کے اتحادیوں کے اتحاد سیٹو کے قیام کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس کے لئے ستمبر 1954 میں مختلف ممالک کے نمائندوں کا اجلاس منیلا [فلپائن] میں ہو رہا تھا۔ پہلے تو ارادہ یہ تھا کہ پاکستان کو اس اجلاس میں مدعو نہیں کیا جائے گا۔ لیکن پھر چرچل اور آئزن ہاور کے مذاکرات کے بعد پاکستان کو اس اجلاس میں بلایا گیا۔ اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد صاحب اور وزیر اعظم محمد علی بوگرہ صاحب تھے۔ وزارت خارجہ کا قلمدان ابھی تک پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کے پاس تھا لیکن وہ اپنا استعفیٰ پیش کر چکے تھے لیکن وزیر اعظم نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اس اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کریں۔ اس اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی بحیثیت وزیر خارجہ ان کا آخری کام تھا۔ پاکستان کی حکومت کو اس اتحاد میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ تجویز کردہ معاہدے کی شق نمبر چار کی رو سے اگر کسی ممبر ملک کے خلاف کوئی اور ملک جارحیت کرے گا تو اس اتحاد میں شامل طاقتیں اس ممبر ملک کی مدد کو آئیں گی۔ پاکستان کو یہ دلچسپی تھی کہ اگر بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو اس معاہدے کی صورت میں یہ اتحاد پاکستان کی مدد کو آئے گا۔ لیکن جب کارروائی شروع ہوئی تو امریکہ کے وزیر خارجہ ڈلس نے یہ واضح کر دیا کہ امریکہ دستخط کرتے ہوئے یہ نوٹ دے گا کہ امریکہ صرف اس وقت اس علاقے میں اپنی فوجیں بھجوائے گا جب کہ اس اتحاد کے ممبر ملک کے خلاف جارحیت کمیونسٹ بلاک کی طرف سے ہو۔ برطانیہ نے واضح کر دیا کہ اگر دولت مشترکہ میں شریک دو ممالک کے درمیان جنگ ہوئی تو ہم چپ سادھ لیں گے۔ پاکستان کے لئے اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اس اتحاد میں اپنے فرائض تو ادا کرے گا لیکن اگر اسے ہندوستان کی طرف سے جارحیت کا سامنا کرنا پڑا تو اس کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ پاکستان کے لئے یہ اتحاد بے معنی تھا۔ پاکستانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے امریکہ کے موقف کی شدید مخالفت شروع کی۔ اور اس اجلاس میں ان کی امریکی وزیر خارجہ ڈلس سے اس مسئلہ پر شدید بحث بھی ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ظاہر ہے امریکہ اپنے موقف پر قائم رہا اور اس نے اس معاہدے پر اس نوٹ کے ساتھ ہی دستخط کیے کہ ہم تو اس وقت ہی حرکت میں آئیں گے جب کسی کمیونسٹ ملک کی طرف سے حملہ ہو۔ جب پاکستان کے دستخط کرنے کا وقت آیا تو چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے اس پر یہ نوٹ لکھا۔ "یہ دستخط اس لئے کیے جا رہے ہیں کہ یہ معاہدہ میری حکومت کو بھجوایا جائے گا۔ وہ اس پر غور کر کے اس کے بارے میں پاکستان کے آئین کے مطابق فیصلہ کرے۔"

وزیر اعظم پاکستان محمد علی بوگرہ نے یہ بیان جاری کیا کہ اس معاہدے میں شرکت کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔ شامل نہ ہونے کی وجہ واضح تھی۔ پاکستان کو اس میں شامل ہو کر کیا ملے گا؟ اسی مرحلہ پر وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے وزارت خارجہ قلمدان بھی خود سنبھال لیا۔ اور جلد ہی یہ مزاحمت دم توڑ گئی اور 19 جنوری 1955 کو پاکستان نے مزید مراعات حاصل کیے بغیر اس معاہدے میں شامل ہونے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔

Seato: The Failure of an Alliance Strategy by Leszak Buszynski p 32-40

پاکستان کا پہلا موقف یہ تھا کہ پاکستان اس معاہدے میں تبھی شامل ہوگا جب یہ واضح ہو کہ جب پاکستان کو جارحیت کا سامنا کرنا پڑا تو اتحادی اس کی مدد کو آئیں گے۔ یہ موقف کیسے تبدیل ہوا؟ اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اعلان تقرری

محترم رحمت اللہ میر بلوچ کی تقرری بطور بیورو چیف صوبہ بلوچستان پاکستان ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل لندن برائے سال یکم اکتوبر 2020ء تا 2022ء عمل میں لائی جا رہی ہے۔ جو کہ ادارہ کے لیے صد افتخار ہے۔ تمام سرکاری وغیر سرکاری ادارے نوٹ فرما لیں اور ان سے تعاون کی درخواست ہے۔

موصوف ایک سیاسی وغیر سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ سیاسی شخصیات اور سوشل سوسائٹی کی تنظیمیں ان کے کام سے متاثر بھی ہیں۔ اور یہ ایک صحافی بھی ہیں۔ علاوہ ازیں بڑے محنتی، سمجھ دار، تعلیم یافتہ اور باہمت شخصیت کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تقرری تمام احباب کے لیے مبارک کرے۔ آمین۔

محی الدین عباسی — چیف ایڈیٹر لاہور انٹرنیشنل لندن

روسو اور ڈیوڈ ہیوم کی دوستی کیوں نہ چل سکی

تحریر: نصیر احمد

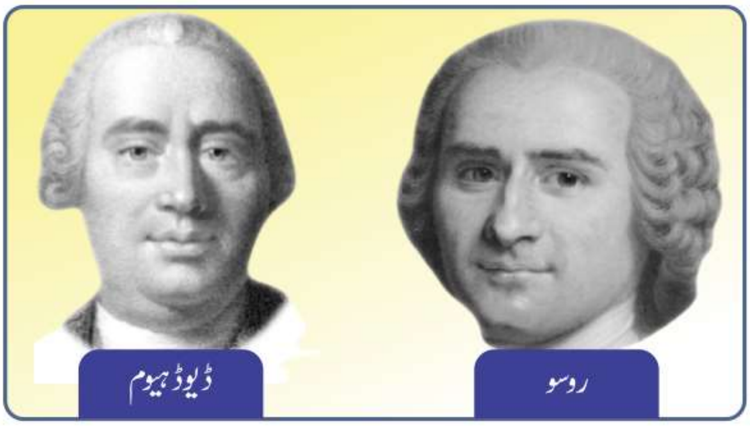

خرد افروزی کے زمانے کے دو اہم فلسفیوں ڈیوڈ ہیوم اور ژاں ژاک روسو کی بات کر رہے ہیں۔ یہ دوستی ہو تو گئی تھی کہ روسو کو ہیوم کی ضرورت تھی اور یہ دوستی ہیوم کی معشوقہ کی آرزو تھی۔ 'ہیوم کی معشوقہ' شاید ہمیں نہیں کہنا چاہیے کہ ہیوم کہیں برا ہی نہ مان جائیں کہ شدید جذبات کو بہ قول افتی بھائی جیسے بلی کبوتر کو دبوچتی ہے دبوچتے عمر گزر گئی ہے، پھر بھی 'ہیوم کی معشوقہ؟' ساری محنت رائیگاں کر دی۔ لیکن روسو کے حامی کہتے ہیں کہ سینٹ ڈیوڈ ہیوم فرانس کی امیر کبیر خرد افروزیوں کے لیے محافل سجانے والی امیر کبیر حسیناؤں نے ہیوم کی دھیمی طبیعت کو کچھ تند تو کر دیا ہوگا کہ ان حسیناؤں کی جانب روانہ کیے ہوئے ناموں میں روسو کے بارے میں ایک ٹُنڈی تو موجود ہے۔ اس معاملے میں روسو کے حامی ہیوم کی ڈھلتی عمر، ان کے موٹاپے اور ان کے حلیے کی بھی ہنسی اڑاتے ہیں۔

ہیوم اپنے بارے میں خود ایسے لکھتے ہیں:

میں دھیمی طبیعت کا مالک ہوں، مجھے اپنے جذبات پر قابو ہے، میرا مزاج کھُلا ڈُلا، معاشرت پسند اور پُرمسرت ہے۔ اور روسو اپنے بارے میں یوں لکھتے ہیں: 'پورے یورپ میں اک بے نظیر تند صدا پھیل گئی' میں کافر تھا، دہریہ تھا، جنونی تھا، پاگل تھا، وحشی جناور تھا، اور ایک بھیڑیا تھا۔' روسو کافر اور دہریے تو نہیں تھے، لیکن جنونی پاگل اور وحشی جناور تو تھے۔ انقلابِ فرانس اور دیگر انقلابوں پر ان کی فکر اور رویے کے اثرات تو یہی بتاتے ہیں۔ جو بھی ہو فکر اور شخصیت کا فرق اتنا تھا کہ دوستی چل نہیں سکتی تھی۔ خرد اور جنون کا قدیمی جھگڑا تھا۔ عقل پسندی اور رومان کی مخاصمت تھی۔ اشرف وحشی اور تہذیب کی جنگ تھی۔ اور اس دوستی کے بارے میں دانش وروں کی پیش گوئیاں بھی تھیں۔ فرانس کے مشہور خرد افروز والٹیئر جن کے نشانے پر اپنی رومانی حسرتوں کی وجہ سے روسو اکثر نشانے پر رہا کرتے تھے، انھوں نے اس دوستی ٹوٹنے پر یہ بیان دیا تھا:

'میں نے ایک ہی دعا تو خدا سے مانگی ہے۔ بہت ہی مختصر، ایسے۔ اے خدا میرے دشمنوں کو دنیا زمانے کے احمق دکھا دے۔' دوستی کی شروعات میں ایک اور فلسفی نے ہیوم سے کہا تھا کہ تم اپنی آستین میں ایک سانپ پال رہے ہو۔ دوستی کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ سِنہ 1765 میں روسو کی تحریروں کی وجہ سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقے روسو کے مخالف ہو گئے تھے۔ ہیوم بھی اپنے ملک میں اتنے پسندیدہ نہیں تھے۔ یونی ورسٹی کی نوکری بھی نہیں ملی۔ ایڈم سمتھ نے ہیوم کے مرنے کے بعد ہیوم کی فلسفیانہ تشکیک کی مرگ کے مقابلے میں بہادری کی کچھ تعریف کی تھی اور شکوے کرنے لگے کہ زندگی میں اتنی گالیاں نہیں ملیں جتنی ہیوم کی موت کا احوال لکھنے کے بعد ملیں۔ لیکن جب ہیوم فرانس میں گئے تو خرد افروز دانش ور مذہب کے خلاف سرگرم تھے۔ وہاں ہیوم کی تشکیک پسندی کا سامنا کٹر قسم کی مذہب دشمنی سے ہوا تو ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی دھیمی طبیعت، پُرمسرت مزاج، حسِ مزاح اور اعتدال پسندی کی وجہ سے ہیوم وہاں ہر قسم کے دانش وروں میں مقبول ہو گئے۔ ایک محفل میں تو کچھ یوں ہوا کہ ہیوم نے شکوہ کیا کہ میں نے تو اپنی زندگی میں کوئی دہریہ نہیں دیکھا۔ تو ایک طرف سے جواب آیا، تو دیکھ لیں، انیس دہریے تو یہیں بیٹھے ہیں۔ محفل میں ہیوم سمیت بیس آدمی تھے۔ اپنے سنسکاروں کی وجہ سے وہ سیلونوں کی خواتین کے بھی بہت زیادہ پسندیدہ ہو گئے۔ ہیوم سے عدم شناسائی ایک طرح کی سماجی موت ہو گئی۔ پیرس میں کسی رئیس زادی کی زینت ہیوم کی موجودگی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ اور ہیوم کو پردیس میں یہ پسندیدگی، اتنی محبت، اتنی چاہت بہت اچھی لگی۔ انھوں نے ایک شہرت قائم کر لی تھی اور وہ یہ شہرت قائم بھی رکھنا چاہتے تھے۔ ہیوم نے فرانس سے اپنے ایک دوست کو کچھ یوں لکھا تھا۔

یہی کہہ سکتا ہوں میں تو یہاں بس شہد بہشت تناول کرتا ہوں، محض اَمرِت پیتا ہوں اور صرف بخُور سونگھتا ہوں۔ ان حالات میں ایک خاتون دوست نے ہیوم سے فرمائش کی کہ وہ روسو کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے جائیں تا کہ روسو کی یورپ میں اپنے مخالفوں سے جان چھوٹے۔ ہیوم انکار نہ کر سکے اور روسو کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئے۔

شروع میں تو خوب گاڑھی چھنی۔ ہیوم کو روسو بہت دھیمے، نرم مزاج اور معتدل لگے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہیوم روسو میں اپنا آپ ہی دیکھ رہے تھے ورنہ روسو میں جتنی بھی خوبیاں تھیں اس کے برعکس تھیں۔ وہ جھگڑالو، بدمزاج اور محسن کُش پہلے سے ہی مشہور تھے۔

روسو کو شہر کا ماحول اچھا نہیں لگا تو ہیوم نے انھیں مضافات میں رہائش لے دی اور بادشاہ جارج سوم سے ان کی پینشن کے حصول کی کوششیں کرنے لگے۔ روسو کو یہ انتظام اچھا نہیں لگا۔ اس کے علاوہ اس بات کا مطالبہ کرنے لگے کہ ان کا کتا سلطان اور ان کی معشوقہ کو بھی انگلینڈ بلوائے جائیں۔ ہیوم نے دونوں بلوا دیے۔ کتے اور معشوقہ دونوں کے بارے میں ہیوم نے ایک اور دوست کو کچھ یوں لکھا، 'ایک ایسے فلسفی کے ساتھ ہوں جو اپنے کتے اور اپنی معشوقہ کو برابری کی بنیادوں پر اپنے پر حکومت کرنے دیتا ہے۔'

پھر پینشن کے سلسلے میں روسو کو شک ہو گیا کہ ہیوم ان کی انگلینڈ میں مقبولیت سے جل گئے ہیں؛ ان کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور ان کو خرد افروز دانش وروں میں بدنام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ہیوم کو دانش وروں میں اپنی شہرت بہت عزیز تھی۔ وہ جتنی اپنی صفائی پیش کرتے، اتنا ہی روسو کو شک بڑھتا۔ اور جتنا روسو کا شک بڑھتا اتنے ہی وہ ہیوم کے خلاف دردبھرے دل توڑ دینے والے نامے لکھتے۔ ہیوم اس طرح کی جذباتیت کے عادی نہ تھے۔ وہ وہی دلائل اور ثبوت پر مبنی بات چیت کرنے کی کوشش کرتے۔ روسو اس طرح کی بات چیت کے عادی نہیں تھے۔ ایک دفعہ تو انھوں نے یہ ثبوت دیا کہ میں نے ہیوم کو نیند میں یوں بڑبڑاتے سنا کہ روسو میرے پاس ہے (اس کے روسو نے یہ معنی لیے کہ ہیوم کے کہنے کا مطلب تھا کہ روسو میری مٹھی میں ہیں)۔ اس طرح کی باتیں کہ مسٹر ہیوم میری شہرت تمھاری مٹھی میں ہے مگر میری شجاعت اور دیانت پر تم قابو نہیں پا سکتے۔ ہیوم اس ڈرامے کا مقابلہ کہاں کر سکتے تھے۔ سازش وغیرہ بھی وہ کیا کر سکتے تھے اور کرنا بھی ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ وہ بس اس طرح کی باتیں ہی کہتے رہے:

'یہ (روسو) سارا جیون صرف محسوس ہی کرتے رہے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے محسوسات اتنے شورانگیز ہو جاتے ہیں جس کی مثال میں نے اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھی۔ لیکن اس سے انھیں مسرت کم اور اذیت زیادہ ہوتی ہے۔' یہ ایک ایسے آدمی کی طرح ہیں جس نے نہ صرف اپنے کپڑے، بلکہ کھال بھی اتار دی ہو۔ اس حالت میں گستاخی اور ہنگامے کے عناصر کے زیرِ اثر لڑنے چل دیا ہو۔' کچھ دنوں یہ جھگڑا چلا جس میں دونوں طرف سے باتیں ہوتی رہیں۔ ایک طرف سے شورانگیز الزامات اور دوسری طرف اپنی ساکھ بچانے کی ایک عقل مندانہ کوشش۔ آخرِ کار روسو ناراض ہو کر انگلینڈ سے چل دیے۔ وہ خرد افروزی کے عُروج کا زمانہ تھا۔ اس لیے ہیوم کی بات دانش وروں میں زیادہ سچ سمجھی جاتی رہی۔ لیکن آج کل ہیوم کی مخالفت میں بھی کیس بنتا رہتا ہے کہ ہیوم نے شاہِ جذبات کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ حسد میں مبتلا ہو کر ایسے حالات پیدا کیے ہیں جس کا مقابلہ ایک عظیم لیکن الجھی ہوئی شخصیت نہیں کر سکی۔ لیکن، ہمارے خیال میں، زیادہ تر رومانوی طبیعتیں ایسے حالات پیدا کرتی ہیں جن کا ہیوم جیسے مزاج کے لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہیوم انسان ہی تھے، انھیں اس بات کا دکھ بھی ہوا ہو گا کہ لوگوں کے سمجھانے کے باوجود ایک ایسے آدمی کی مدد کی جس کے لیے اس کے واہمے ہر اچھائی سے معتبر تھے۔ دوستوں سے روسو کی ناروائی کی شکایت بھی کی ہو گی۔ روسو کا کچھ ہنسی مذاق بھی اڑایا ہو گا، لیکن ایک بات تو دیکھنے کی ہے کہ مدد اس میں ہیوم کر رہے ہیں۔ اپنے ساتھ انگلینڈ لا رہے ہیں، گھر دلوا رہے ہیں۔ کتا اور معشوقہ بلوا رہے ہیں، پینشن دلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور سازش بھی نہیں کر رہے۔ وہی رومان کا مسئلہ لیکن یہی ہے کہ جذباتیت کا حقائق سے کوئی ناتا نہیں اور سب کچھ روا ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح کی جذباتیت کے اثرات ہوتے۔ برٹرینڈ رسل کے مطابق روسو کی فکر کا انجام ہٹلر ہے۔ انقلاب فرانس، سوویت انقلاب، نازی (نازی) انقلاب اور انقلابِ ایران پر روسو کے اثرات ہیں۔ افادیت پسندی کے نتیجے میں ہونے والی قانون سازی پر ہیوم کے اثرات ہیں۔ ایڈم سمتھ کی معاشیات پر ہیوم کے اثرات ہیں۔ فلسفے میں منطقی مثبتیت پر ہیوم کے اثرات ہیں۔ اور ایک تشکیک جو علم اور تنقید کے لیے ضروری ہے اس پر بھی ہیوم کے اثرات ہیں۔ ہمارے خیال میں آزادی کے سنگ، خرد انسانی زندگی کی تعمیر میں زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ اور غلامی کے سنگ، جنون تخریب جنون کا ایک نتیجہ ہے۔ جذبات اور خرد کے ایک توازن کا حصول بہت ضروری ہے اور اس کے لیے جذبات کی جنون کی طرف پیش رفت کی روک تھام بہت ضروری ہے۔ اور خرد کو جذبات سے تہی کرنا بھی نادانی ہے کہ اس سے خرد انسانی فلاح میں مددگار ثابت نہیں ہو سکے گی۔

حوالہ جات

ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی، برٹرینڈ رسل

اینلائٹنڈ اینیمیز، ڈیونڈ ایڈ منڈز اینڈ جان ایڈینو، دی گارڈین، 29 اپریل 2006

انٹرنیٹ انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی (ژان ژاک روسو)

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (ڈیوڈ ہیوم سکاٹش فلاسفر)

ڈیوایٹ ژان ژاک، ٹم میڈیگان، فلاسفی ناؤ، مارچ/اپریل 2011

بے چارہ کنگلا جو بائیڈن

سابق امریکی نائب صدر اور مستقبل کے صدر مسٹر جو بائیڈن نے اپنے عہدے کی مدت ختم ہونے سے چند روز قبل انکشاف کیا تھا کہ دو سال قبل جب اس کے جواں سال بیٹے کو کینسر کے مرض نے گھیر لیا تو وہ اس کے علاج کیلئے پیسے پیسے کا محتاج ہو گیا۔ اس مقصد کیلئے اس نے اپنا واحد اثاثہ جو کہ 4 ہزار سکوائر فٹ گھر تھا، اونے پونے داموں بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ قرض وہ اس لئے نہ لے سکا کیونکہ ایک تو اس کی شرائط بہت سخت تھیں، دوسرا اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنی مدت ملازمت کے بعد بھی قرض کی قسطیں ادا کر سکتا۔ گھر کا سودا تقریباً ہو چکا تھا کہ صدر اوبامہ کو کسی طرح پتہ چل گیا اور اس نے اپنے ذاتی بنک اکاؤنٹ سے جو بائیڈن کی مدد کر کے اس کا گھر بیچنے سے بچا لیا۔ جنوری 2015ء میں لیکن بائیڈن کا بیٹا کینسر جیسے موذی مرض کا مقابلہ نہ کر سکا اور دنیا سے چلا گیا۔ اوباما کی الوداعی تقریب کے دوران یہ انکشاف کرتے ہوئے جو بائیڈن آبدیدہ ہو گئے تھے۔ یہ کوئی نسیم حجازی کے ناول کی داستان نہیں بلکہ دنیا کے سب سے طاقتور ملک امریکہ کے نائب صدر اور مستقبل کے امریکی صدر کی بالکل سچی کہانی ہے۔

کیا مملکت اسلامیہ پاکستان سمیت دنیا کے کسی ایک مسلمان ملک کے حکمران ایسی کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہونگے جیسی امریکہ کے نائب صدر بائیڈن کی تھی؟ چند سوالات ہیں جن کے جواب میں پاکستانیوں پر چھوڑتا ہوں:

1- کیا امریکی نائب صدر بنکوں سے قرضہ لے کر معاف نہیں کروا سکتا تھا؟

2- کیا امریکی نائب صدر کا کوئی دوست میاں منشا، جہانگیر ترین، راشد خان اور ملک ریاض نہیں تھا جو اسے اربوں کی پراپرٹی بغیر کسی لالچ کے دے دیتا؟

3- کیا امریکی نائب صدر اتنا نکما اور بیوقوف تھا کہ وہ برطانیہ، دبئی یا پانامہ میں آف شور کمپنی تک نہ بنا سکتا؟ یا پھر پاپا جونز کی فرنچائز نہیں لے سکتا تھا۔

4- کیا امریکی نائب صدر کا کوئی ایسا بیٹا نہیں تھا جس نے کم عمری میں اربوں کی جائیدادیں بنائی ہوں۔ یا پھر ایسی سابقہ بیوی یا معشوقہ نہیں تھی جو تین سو کنال پر گھر بنا دیتی۔

5- کیا امریکی صدر کی کوئی ایسی بہن نہیں تھی جس نے سلائی کی مشین سے اربوں روپے کی جائیدادیں بنائی ہوں۔

6- کیا امریکی نائب صدر کے پاس کوئی ایسا مولوی نہیں تھا جو اسے کرپشن کو حلال کرنے کے شرعی طریقے سمجھا سکتا اور اپنا حصہ بقدر جثہ وصول کر سکتا؟

7- کیا امریکی نائب صدر کے پاس پاکستانی حکمرانوں جیسے صوابدیدی اختیارات نہیں جن کے تحت جب چاہے اربوں روپے کے ذاتی جہاز خرید سکیں، 35 لاکھ روپے کا ڈنر کر سکیں، سرکاری خرچ پر وزیراعظم کی تزئین و آرائش پر کروڑوں روپے خرچ کر سکیں؟ اور پھر انہی صوابدیدی اختیارات کے تحت چند کروڑ اپنی جیب میں ڈال کر (اللہ تیرا شکر ہے) کہہ سکیں؟

یہ امریکی دنیا کے بادشاہوں کی ایمانداری کا حال ہے! منقول

مدح

جان و دِلم فدائے جمالِ محمدؐ است

خاکم نثارِ کوچۂ آلِ محمدؐ است

دِدیم بعَینِ قلب و شنیدم بگوشِ ہوش

در ہر مکاں ندائے جلالِ محمدؐ است

اِیں چشمۂ رَواں کہ بخلقِ خُدا دِہَم

یکْ قطرۂ زِبحرِ کمالِ محمدؐ است

اِیں آتشم، زِآتشِ مہرِ محمدی ست

وِیں آبِ من، زِآبِ زُلالِ محمدؐ است

شہزادی ثروت الحسن: اُردن کے شہزادے حسن بن طلال کی پاکستانی لڑکی ثروت اکرام اللہ سے افسانوی شادی کی داستان

تحریر: عقیل عباس جعفری

یہ نصف صدی پہلے کا قصہ ہے جب کراچی میں شادی کی ایک ایسی تقریب منعقد ہوئی جس کی خوشی میں کراچی کے درودیوار جگمگا اٹھے، یہ تقریب ٹیلی ویژن پر نشر ہوئی اور نکاح نامے پر دوممالک کے سربراہان نے بطور گواہ دستخط کیے۔

اس رشتے کی منظوری سے پاکستان بھر میں خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی

یہ 15 جولائی 1968ء کی بات ہے جب اُردن کے بادشاہ شاہ حسین کے چچا شریف حسین بن ناصر پاکستان کے سابق سیکریٹری خارجہ اکرام اللہ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ثروت کے لیے اُردن کے ولی عہد شہزادہ حسن بن طلال کا رشتہ لے کر پاکستان تشریف لائے۔ اس رشتے کی منظوری سے پاکستان بھر میں خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ثروت جنھیں اُن کے گھر والے پیار سے 'ڈیٹلم' کہتے تھے 24 جولائی 1947 کو کلکتہ میں پیدا ہوئی تھیں، وہ برطانیہ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل تھیں، اور اردو، انگریزی اور فرانسیسی زبان پر یکساں عبور رکھتی تھیں۔ شہزادہ حسن سے ان کی ملاقات چند برس پہلے برطانیہ میں ہوئی تھی جہاں وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ان کے ہم جماعت تھے۔ شہزادہ حسن 20 مارچ 1947ء کو عمان میں پیدا ہوئے تھے اور عربی، انگریزی، ہسپانوی اور عبرانی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ پھر 27 اگست 1968ء کا دن آیا جب کراچی کے بین الاقوامی ایئرپورٹ پر اُردن سے آئی ہوئی بارات اُتری۔ اُن سے پہلے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان اس برات کے خیر مقدم کے لیے کراچی پہنچ چکے تھے۔ برات کا طیارہ اُردن کے شاہ حسین خود اڑا رہے تھے۔ طیارہ زمین پر اترا تو ایئرپورٹ کی فضا شاہ حسین زندہ باد اور صدر ایوب زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ برات میں شاہ حسین اور شہزادہ حسن کے علاوہ اُردن کے وزیر اعظم بہجت طلہونی، سیکریٹری جنرل زید انضمائی، شہزادی منیٰ الحسین، شہزادی عالیہ، شہزادی بسمیہ اور چند دیگر حکام شامل تھے۔ ایوب خان نے برات کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ پاکستان میں اُردن کے سفیر عکاش الزین اور اردن میں پاکستان کے سفیر راحت سعید چھتاری بھی موجود تھے۔ دوسری سمت ثروت کی والدہ بیگم شائستہ اکرام اللہ، جو خود پاکستان کے لیے سفارت کاری کے فرائض سرانجام دے چکی تھیں، اور صدر ایوب خان کی صاحبزادی نسیم اورنگ زیب موجود تھیں۔

شہزادہ حسن بن طلال اپنی خوش دامن کے پاس پہنچے اور اُن کے سامنے سر جھکا دیا۔ بیگم اکرام اللہ نے دعائیں دیتے ہوئے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔ برات کو گارڈ آف آنر پیش کیا گیا جس کے بعد برات سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے لیے روانہ ہوگئی، کراچی کی آراستہ سڑکوں پر پاکستانی عوام خیر مقدمی نعروں سے برات کا استقبال کر رہے تھے اور صدر ایوب، شاہ حسین اور شہزادہ حسن کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھے۔ کئی مقامات پر استقبالیہ بینڈ بھی فضا میں موسیقی بکھیر رہے تھے اور پھول نچھاور کیے جا رہے تھے۔ ایوان صدر میں بیگم شائستہ اکرام اللہ کی جانب سے ظہرانے کا انتظام تھا۔ شام کو شاہی خاندان کلفٹن میں بیگم شائستہ اکرام اللہ کے گھر کا (شانہ) پہنچا، جہاں مہندی کی رسم ادا کی گئی، اس رسم میں ثروت جو اب شہزادی ثروت کہلانے لگی تھیں کی والدہ، بہنوں اور قریبی دوستوں نے شرکت کی۔ سات سہاگنوں نے شہزادی ثروت کی ہتھیلی پر مہندی رکھ دی اور پھر ان کی دوستوں نے ایک حسین مشرقی رقص پیش کیا۔ اُردن کی شہزادیاں یہ منظر حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اس رات شہر بھر میں چراغاں کیا گیا تھا مگر ایوان صدر سے کاشانہ تک کی سڑک کو تو کچھ زیادہ ہی اہتمام کے ساتھ سجایا گیا تھا۔

اگلے دن 28 اگست 1968ء کو دلہن کے گھر نکاح کی تقریب تھی۔ اس تقریب میں بھی شہزادی ثروت کی بہنوں اور دوستوں نے بہت دھوم مچائی۔ شہزادہ حسن نے ان سب میں گھڑیوں اور دینار کے تحفے تقسیم کیے، پھر ایک سادہ سی تقریب میں رسم نکاح ادا کی گئی۔ یہ نکاح عالم دین مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے پڑھایا۔ اس نکاح میں اُردن کے شاہ حسین، وزیر اعظم بہجت طلہونی اور پاکستان کے صدر ایوب خان کے علاوہ اعلیٰ حکام نے شرکت کی۔ نکاح نامے پر شاہ حسین اور صدر ایوب خان نے بطور گواہان دستخط کیے۔ پھر آرسی مصحف کی رسم شروع ہوئی۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ اور ان کے گھر کی خواتین نے دلہا کو سلامی پیش کی مگر جب دلہا واپس جانے کے لیے سٹیج سے اترے تو معلوم ہوا کہ

ان کا جوتا چھپایا جاچکا ہے۔دلہن کی بہنوں نے دو ہزار دینار لے کر بہنوئی کا جوتا واپس کیا۔اب برات کی واپسی کا وقت تھا۔محترمہ شائستہ اکرام اللہ نے کراچی کے ایک ہوٹل میں عصرانے کا اہتمام کیا تھا جس میں دلہا اور دلہن کے علاوہ سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔اس تقریب میں کراچی کی مشہور شاعرہ وحیدہ نسیم نے حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا اور مبارک باد پیش کی۔

مبارک ارض پاکستان کو یہ عزت افزائی
فضائے قبلہ اوّل نے کی جس کی پزیرائی
مبارک ہو مبارک، عالم اسلام کو ثروت
حسن کی ہو بصیرت، ملت بیضا کی بینائی

وحیدہ نسیم کے بعد مشہور مغنیہ مختار بیگم نے بھی بغیر ساز کے مبارک باد کا نغمہ گایا۔یہ تقریب ٹیلی ویژن سے بھی نشر کی گئی جسے دیکھنے کے لیے ہر گھر میں لوگوں کے ہجوم لگے ہوئے تھے۔رات کو شاہ حسین نے دلہا دلہن اور ان کے اہلخانہ کو ایوان صدر میں عشائیہ دیا۔اس تقریب میں بھی صدر ایوب خان نے بطور خاص شرکت کی۔انھوں نے شہزادہ حسن اور شہزادی ثروت کو سونے کا ایک جڑاؤ سیٹ بطور تحفہ عطا کیا اور ایک خوشنما شمع دان بھی دیا۔متعدد ممالک کے سفیروں نے بھی تحائف پیش کیے۔عشائیے کے بعد شہزادی ثروت اپنی والدہ کے ہمراہ اپنی قیام گاہ کاشانہ واپس آ گئیں۔

چند ماہ بعد 11 نومبر 1968ء کو شہزادی ثروت رخصت ہو کر اپنے سسرال چلی گئیں جہاں وہ آج بھی بڑی خوش وخرم زندگی گزار رہی ہیں۔شہزادی ثروت کے یہاں تین بیٹیاں (رحما،ثمایا اور بادیہ) اور ایک بیٹا (راشد بن حسن) پیدا ہوا۔ان کی اور شہزادہ حسن کی تصاویر اُردن کے ڈاک ٹکٹوں پر بھی شائع ہوئی۔وہ پہلی پاکستانی خاتون تھیں جن کی تصویر کسی غیر ملکی ڈاک ٹکٹ پر شائع ہوئی تھی۔وہ دنیا کی خوش لباس ترین خواتین میں شمار ہوتی ہیں،ان کے کپڑے پاکستان کے معروف فیشن ڈیزائنر رضوان بیگ تیار کرتے ہیں۔عمان میں ان کے محل کی اندرون خانہ آرائش پاکستانی ڈیزائنر میاں احد نے کی ہے۔وہ اردن کی بیڈمنٹن فیڈریشن کی اعزازی صدر بھی رہی ہیں اور انھوں نے تائیکوانڈو میں بلیک بیلٹ بھی حاصل کیا ہے۔شہزادہ حسن کی دلچسپیاں سیاست سے زیادہ لکھنے پڑھنے سے رہی ہے اور وہ کئی کتابوں کے مصنفہ ہیں۔انھیں دنیا کے متعدد ممالک نے اپنے اعلیٰ اعزازات سے سرفراز کیا ہے جبکہ متعدد یونیورسٹیوں نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کی ہیں۔شادی کے بعد سال ہا سال شہزادہ حسن اردن کے ولی عہد کے منصب پر فائز رہے لیکن پھر کہانی میں ایک نیا موڑ آیا اور شاہ حسین نے اپنی وفات (سات فروری 1999) سے چند روز قبل اپنے صاحبزادے شہزادہ عبداللہ کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا جنھوں نے شاہ حسین کے انتقال کے فوراً بعد بادشاہت کا منصب سنبھال لیا۔شہزادہ حسن نے بڑے وقار کے ساتھ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی اور نئے ولی عہد کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا۔شہزادی ثروت اور شہزادہ حسن کی یہ شادی افسانوی شادیوں جیسی تھی اور اس کی یاد آج تک اہل پاکستان کے دلوں میں زندہ ہے۔

❀❀❀

☼☼☼

ایک نیا شاعر اپنے استاد کے پاس جا کر کہنے لگا کے استاد آج دن میں ایک شادی ہے جس میں مجھے سہرا پڑھنا ہے اور آج اک آدمی بھی مر گیا شام کو مجھے اسکا مرثیہ بھی پڑھنا ہے کلام میرے پاس ہے نہیں لہٰذا آپ لکھ دیں استاد نے اک کاغذ اٹھا کر اسے بیچ سے موڑا اور ایک طرف سہرا لکھ دیا اور دوسری طرف مرثیہ لکھ دیا اب یہ حضرت شادی پہنچے اور کاغذ کو بیچ سے کھول کر سہرا پڑھنا شروع کر دیا تو اب ایک مصرع سہرے کا اور ایک مصرعہ مرثیے کا پڑھا جا رہا ہے۔ملاحظہ کریں..

اچھے میاں کا عقد ہوا ہے بہار میں
کہدو کسی سے پھول بچھا دے مزار میں

روئے حسین پہ سہرے سے کیسی بہار ہے
اے موت جلد آ کہ تیرا انتظار ہے

دولھا دلھن شریف گھرانے میں ہیں پلے
لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے

نوشہ کو عروس بڑی ذی ہنر ملی
مرحوم کو حیات بڑی مختصر ملی

یا رب بنی کے ساتھ ہمیشہ بنا رہے
یہ کیا رہیں گے جب نہ رسول خدا رہے

نوشہ کو عروج وہ رب جلیل دے
اور اس کے وارثین کو صبر جمیل دے

دلاورفگار

☼☼☼

سماجی سرگرمیاں

رپورٹ عابد شمعون چاند
سعودی عرب

پاکستان اوورسیز کمیونٹی گلوبل سعودی عرب کے وفد کے چیئرمین چوہدری اظہر وڑائچ کی سربراہی میں قونصل جنرل جدہ خالد مجید سے ملاقات،

ملاقات میں پاکستانی کمیونٹی کو درپیش مسائل اور ان کے ممکنہ حل کے لئے تجاویز پیش کی گئیں قونصل جنرل خالد مجید کا ملاقات کے دوران کہنا تھا کہ انشاء اللہ ہم سب مل کر دیار غیر میں رہتے ہوئے اور یہاں کے قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے ایک نئے پاکستان کی بنیاد رکھنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے، ان کا مزید کہنا تھا کہ پی او سی گلوبل ایک اچھا اقدام ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ آپ سب لوگ دیار غیر میں اوورسیز پاکستانیوں کی خدمت کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے اور اس مقصد کے لیے جدہ قونصلیٹ ہر ممکنہ تعاون کے لئے تیار ہے۔ ملاقات میں چیئرمین پی او سی گلوبل چوہدری اظہر وڑائچ نے تنظیم کے اغراض و مقاصد کے بارے میں بتایا کہ پاکستان اوورسیز کمیونٹی گلوبل کا بنیادی مقصد اوورسیز پاکستانیوں کو ووٹ کا حق دلوانا، اسمبلی میں اوورسیز پاکستانیوں کے لئے مخصوص نشستیں، اوورسیز پاکستانیوں کے پاکستان سے متعلق مسائل جیسے جائیداد کا تنازعہ اور قبضہ جیسے مسائل میں رہنمائی کرنا، نئے آنے والے اوورسیز پاکستانیوں کو مقامی قوانین کے متعلق آگاہی دینا شامل ہے۔ صدر پی او سی گلوبل الریاض امتیاز احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی پروفائل کو بڑھانے اور ان کے جائز حقوق کی مؤثر طریقے سے حفاظت کے لئے کوشش کی جائے۔ ملاقات میں چوہدری طاہر فاروق، زائد بن سرور، میاں محی الدین، سائرہ شمس اور دیگر نے بھی اظہار خیال کیا۔ آخر پر قونصل جنرل کو پی او سی گلوبل کی پروفائل بھی پیش کی گئی۔

ماہر تعلیم کا اجلاس

ریاض (عابد شمعون چاند) سعودی دارلحکومت الریاض میں فنون لطیفہ اور طلباء کی استعداد کار کی ترقی اور ترویج کے لئے معروف ماہر تعلیم پروفیسر عظمت اللہ بھٹہ کی رہائش گاہ پر ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں مختلف علمی و ادبی اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ماہرین نے شرکت کی، اس موقع پر طلباء کی مختلف غیر نصابی سرگرمیوں اور فنون لطیفہ اور آئی ٹی جیسے شعبوں میں ترقی اور ترویج کی ضرورت پر زور دیا گیا اور ایک نئی سماجی تنظیم ''اظہار'' کی بنیاد رکھی گئی جس کے اغراض و مقاصد میں یہ طے کیا گیا کہ طلباء کو فن تحریر و تقریر، شعری و نثری ادب، مصوری، نامہ نگاری، مضمون نگاری اور آئی ٹی جیسے اہم شعبوں میں تربیت اور معاونت فراہم کی جائے گی، اس موقع پر باہمی مشاورت سے تنظیمی ڈھانچے کا اعلان کیا گیا جس میں تنظیم کی صدارت پروفیسر عظمت اللہ بھٹہ، سینئر نائب صدر ذوالفقار احمد، نائب صدر معروف شاعر شاہد خیالوی، جنرل سیکرٹری راشد محمود، جوائنٹ سیکرٹری انجینئر محمد

اعجاز اور ہیڈ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی عبدالصبور کو مقرر کیا گیا جبکہ مجلس عاملہ کے اراکین نے فیصلہ کیا کہ تنظیم کی سرپرستی کے لئے سفیر پاکستان راجہ علی اعجاز سے درخواست کی جائے گی۔ اس موقع پر اجلاس کی صدارت پروفیسر عظمت اللہ بھٹہ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض راشد محمود نے انجام دئے، دیئے اجلاس سے دیگر مقررین نے بھی خطاب کیا اور تنظیمی پیش رفت اور طلباء کی استعداد کار بڑھانے کے طریقہ کار طے کرنے پر پروفیسر عظمت اللہ بھٹہ کا شکریہ ادا کیا گیا۔

ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن کی نیوز رپورٹ

ریاض (عابد شمعون چاند) سعودی عرب کی سب سے بڑی اور معروف ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایم ایکس (MX) ٹی ٹوئنٹی کرکٹ ٹورنامنٹ کے چاروں فائنلز میچز اختتام پذیر ہو گے جن کو دیکھنے کے لیے شائقین کرکٹ کی بڑی تعداد نے شرکت کی ایم ایکس (MX) ٹی ٹوئنٹی کے فائنل کی اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی سعودی عرب نیشنل ٹیم کے سابق کپتان مشہور و معروف آل راؤنڈر ندیم بابر نے کہا یہ ٹی ٹوئنٹی میچز موٹرن کرکٹ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن نے ہمیشہ سے کرکٹ کو فروغ اور کھلاڑیوں کے ٹیلنٹ کو اجاگر کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا ہے جو قابل ستائش ہے ندیم بابر نے ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن کے پیٹرن انچیف پرنس عبدالعزیز بن ناصر بن عبدالعزیز کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کی خصوصی دلچسپی سے آج سعودی عرب میں کرکٹ کے کھیل کو بھرپور فروغ مل رہا ہے انہوں نے خاص طور پر آر سی اے چیئرمین اور پیٹرن محمد انور صدر طارق جاوید سینئر نائب صدر ناصر عباسی کی کوششوں اور کاوشوں کو سراہا۔ تقریب سے ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن کے سینئر نائب صدر ناصر عباسی نے کہا کہ سعودی عرب میں کرکٹ کا مستقبل بہت روشن ہے ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن جس لگن محنت اور محبت سے کرکٹ کی آبیاری کر رہی ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ناصر عباسی نے مزید کہا کہ ریاض میں کرکٹ کو رائج کرنے کا سہرا ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن کے سی ای او ندیم بابر کے سر پر ہے جو دن رات کرکٹ کو بہتر سے بہتر کرنے کی لگن میں مصروف عمل ہے۔ تقریب سے ریاض کرکٹ ایسوسی کے عہدیداروں جن میں نائب صدر عاشق مغل، امپائرنگ کوآرڈینیٹر عاطف، الیکٹرانک میڈیا انچارج سمیع اللہ نجار، اور میڈیا کوآرڈینیٹر رستم علی اور دیگر نے بھی خطاب کرتے ہوئے ایم ایکس ٹی ٹوینٹی ٹورنامنٹ کو شاندار ٹورنامنٹ قرار دیا اور کھلاڑیوں کی بہترین کھیل کو سراہا اور کہا کہ ریاض کرکٹ ایسوسی ایشن آئندہ بھی ایسے تاریخ ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتی رہے گی۔

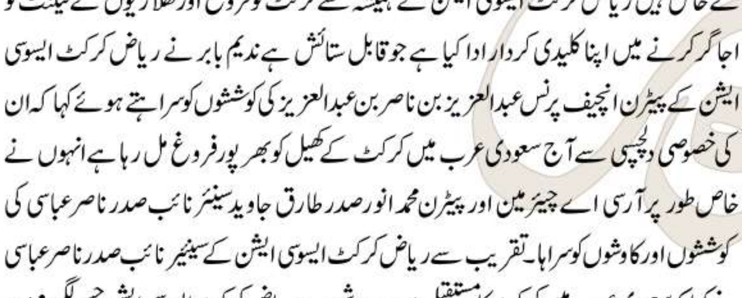

ایمان بالرّسالت

اِس کے بعد چوتھا رُکن ایمان کا ایمان بالرّسول ہے۔ بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ڈھیروں ڈھیر کتابیں ہیں۔ پُرانے لوگوں کی یادداشتیں ہیں۔ ہم نیکی اور بدی کو سمجھتے ہیں۔ کسی مامور ومُرسل کی کیا ضرورت ہے؟

یہ لوگ اپنے مخازنِ علوم کو کافی سمجھتے ہیں اور خطرناک جُرم کے مُرتکب ہوتے ہیں کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور باغی ٹھہرائے جاتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے تو وہ مقابلہ کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ایک اِنسان کو معظّم و مکرّم اور مطاع بنانا چاہتا ہے تو ہر ایک کا فرض ہے کہ رضاءِ الٰہی کو مقدّم کرے اور اس کو اپنا مطاع سمجھے۔ ارادۂ الٰہی کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اس کے مقابلہ میں تو جو آئے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ پس جو خلاف ورزی کرتا ہے یا یہ سمجھتا ہے کہ میرے علوم کے سامنے اس کی احتیاج نہیں وہ اس تعظیم، مکرمت، اعزاز میں جو اس مطاع مکرّم و معظّم کے متبعین کو ملتا ہے حصّہ دار نہیں ہوتا بلکہ محروم رہ جاتا ہے خواہ ایسا اِنسان اپنے طور پر کتنی ہی نیکیاں کرتا ہو مگر اس ایک انسان کی مخالفت اور خلاف ورزی سے اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عظیم الشّان منشاء کے خلاف کرتا ہے۔ اس پر بغاوت کا الزام ہے۔ دُنیوی گورنمنٹوں کے نظام میں بھی یہی قانون ہے۔ ایک بھلا مانس آدمی جو کبھی بدمعاملگی نہیں کرتا۔ چوری اور رہزنی اس کا کام نہیں۔ تاجر ہے تو چونگی کا محصول اور دوسرے ضروری محاصل کے ادا کرنے میں سُستی نہیں کرتا۔ زمیندار ہے تو وقت پر لگان ادا کرتا ہے لیکن اگر وہ یہ کہے کہ بادشاہ کی ضرورت نہیں اور اس کے اعزاز واکرام میں کمی کرے تو یہ شریر اور باغی قرار دیا جاوے گا۔

اِسی طرح پر ماموروں کی مخالفت خطرناک گناہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور ہو سکتا ہے۔ اِبلیس نے یہی گناہ کیا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کے حضور شیاطین بہت دھوکے دیتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ لوگ بڑے ہی بدبخت ہیں جو اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ذرّہ ذرّہ اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ معزّز و مکرّم اور مطاع ہو تو اس کی مخالفت کرنے والا تباہ نہ ہو تو کیا ہو؟ یہی سرّ ہے جو انبیاء و مرسل اور مامورین کے مخالف ہمیشہ تباہ ہوئے ہیں۔ وہ جرم بغاوت کے مجرم ہوتے ہیں۔

پس کتابوں کے بعد رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے ورنہ اِنسان متکبرّ ہو جاتا ہے اور پہلا گناہ دین میں خلیفۃ اللہ کے مقابل یہی تھا اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ۔ اس میں شک نہیں کہ سنت اللہ اسی طرح پر ہے کہ ماموروں پر اعتراض ہوتے ہیں۔ اچھے بھی کرتے ہیں اور بُرے بھی۔ مگر اچھوں کو رجوع کرنا پڑتا ہے اور بُرے نہیں کرتے۔ مگر مبارک وہی ہیں جو اعتراض سے بچتے ہیں کیونکہ نیکوں کو بھی آخر مامور کے حضور رجوع اور سجدہ کرنا ہی پڑا ہے۔ پس اگر ملک کی طرح بھی ہو پھر بھی اعتراض سے بچے کیونکہ خدا تو سجدہ کرائے بغیر نہ چھوڑے گا ورنہ لعنت کا طَوق گلے میں پڑے گا۔

جزا وسزا

اِس کے بعد پانچواں رُکن ایمان کا جزا وسزا پر ایمان ہے۔ یہ ایک فطرتی اصل ہے اور انسان کی بناوٹ میں داخل ہے کہ جزا اور بدلے کے لئے ہوشیار اور سزا سے مضائقہ کرتا ہے۔ یہ ایک فطرتی مسئلہ ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک بچہ بھی جب دیکھتا ہے کہ یہاں سے دُکھ پہنچے گا وہاں سے ہٹتا ہے اور جہاں راحت پہنچتی ہے وہاں خوشی سے جاتا ہے۔ چلاّ چلاّ کر بھی جزا لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فاسق و فاجر کی فطرت میں بھی یہ امر ہے۔

ایک آدمی کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسرے کے سامنے ذلیل وخوار ہو۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ معزّز ہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ فیل ہونے سے ایک بچہ کو کیسی ذِلت پہنچتی ہے۔ بعض اَوقات اِن ناکامیوں نے خودکشیاں کرا دی ہیں اور پاس ہونے سے کیسی خوشی ہوتی ہے۔ زمینداروں کو دیکھا جب بروقت بارش نہ ہو، پھل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ کیسا رنج ہوتا ہے! لیکن اگر غلّہ گھر لے آئے تو کیسا خوش ہوتا ہے! اِسی طرح ہر حرفہ و صنعت والا دکاندار۔ غرض کوئی نہیں چاہتا کہ محنت کا بدلہ نہ ملے اور بچاؤ کا سامان نہ ہو۔

پس جب یہ فطرتی امر ہے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان کا جُزو رکھا ہے کہ جزا وسزا پر ایمان لاؤ اللہ مالک یَوم الدّین ہے۔ روزِ روشن کی طرح اس کی جزائیں سزائیں ہیں اور وہ مخفی نہ ہوں گی اور مالکانہ رنگ میں آئیں گی جیسے مالک اچھے کام پر انعام اور بُرے کام پر سزا دیتا ہے۔ اِس حصّہ پر ایمان لا کر انسان کامیاب ہو جاتا ہے مگر اس میں سُستی اور غفلت کرنے سے ناکام رہتا ہے اور قربِ الٰہی کی راہوں سے دُور چلا جاتا ہے۔

دوسرا سوال

پھر دوسرا سوال جو جبرائیل نے تعلیم الدّین کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور آپ نے اس کا جواب دیا وہ ہے مَاالْاِسْلَامُ؟ اِس کا جواب جو پاک انسان خاتم الانبیاء وخاتم الاولیاء خاتمُ الکمالات کی زبان سے نکلا وہ یہ ہے اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ

اِلَّا اللّٰہُ۔

جو بات اِنسان کے دِل سے اُٹھتی ہے ضرور ہے کہ اس کا اثر اس کے اعضاء و جوارح اور مال پر پڑے۔ کون نہیں سمجھتا کہ شجاعت اگر اندر ہوتو وہ اپنے ہاتھ، بازو اور اعضاء سے محل وموقع پر اس کا ثبوت نہ دے گا۔ اگر وہ موقع پر بھاگ جاتا اور بُزدلی ظاہر کرتا ہے تو کوئی اس کو شجاع نہیں کہہ سکتا۔ اِسی طرح سخاوت ایک عمدہ جوہر ہے لیکن اگر اس کا اثر مال پر نہیں پڑتا تو وہ سخاوت نہیں بُخل ہے۔ ایسا ہی عفّت ایک عمدہ صفت ہے ضرور ہے کہ جس میں یہ صفت ہو وہ بدنظری اور بے حیائی سے بچے اور تمام فواحش اور ناپاک کاموں سے پرہیز کرے۔ اِسی طرح جس کے اندر قناعت ہو ضروری ہوگا کہ وہ دوسروں کے مال پر بے جا تصرّف سے پرہیز کرے گا۔ غرض یہ ضروری بات ہے کہ جب اندر کوئی بات ہو تو اس کا اثر جوارح اور مال پر ضرور ہوتا ہے۔ پس اگر سچی نیازمندی، فرمانبرداری، تحریکِ ملائکہ، کتابوں، ماموروں، خلفاء اور مصلحوں کی اطاعت میں ہو اور دِل میں یہ بات ہو تو زبان پر ضرور آئے گی اور وہ اظہار کرے گا۔ اگر سچائی سے کسی اِنسان کو مانا ہؤا ہو اور اس کے اظہار سے مضائقہ ہو تو یاد رکھو دِل کمزور ہے۔ اِسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے اسماء پر کامل یقین ہو اور اس کے رسولوں پر، ملائکہ پر اور کتابوں اور انبیاء پر یقین ہو اور ایسا ہی اس یقین میں اس کے نواب اور اللہ کا قرب داخل ہے تو اس یقین کا اثر زبان پر آتا ہے اور وہ ایک لذّت کے ساتھ کہہ اُٹھتا ہے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا ا ، وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

بے رَیب سیّد الاوّلین والآخرین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل صفات والا انسان کل سچائیوں اور علومِ حقہ کا لانے والا ہے۔ جب یہ اقرار اور وہ ایمان ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سچی نیازمندی کے ساتھ جنابِ الٰہی کے حضور پیش ہو اور یہی نماز ہے۔ نماز ظاہری پاکیزگی اور ہاتھ منہ دھونے اور ناک صاف کرنے اور شرم گاہوں کو پاک کرنے کے ساتھ یہ تعلیم دیتی ہے کہ جیسے میں اس ظاہر پاکیزگی کو ملحوظ رکھتا ہوں اندرونی صفائی اور پاکیزگی اور سچی طہارت عطا کر اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور سبحانیت، قدوسیت، مجدّیت پھر ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور اس کے مِلک وملک میں تصرّفات اور اپنی ذمّہ داریوں کو یاد کرکے کہ اس قلب کے ساتھ ماننے کو تیار ہوں۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر تیرے حضور کھڑا ہوتا ہوں۔ اِس قسم کی نماز جب پڑھتا ہے تو پھر اس میں وہ خاصیّت اور اثر پیدا ہوتا ہے جو اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ میں بیان ہوا ہے۔ پھر پاک کتاب کا کچھ حصہ پڑھے اور رکوع کرے اور غور کرے کہ میری عبودیت اور نیازمندی کی انتہا بجز سجدہ کے اَور کوئی نہیں۔ جب اِس قسم کی نماز پڑھے تو وہ نیازمندی اور سچائی جب اعضاء اور جوارح پر اپنا اثر کر چکی تو اَور جوش مار کر ترقی کرے گی اور اس کا اثر مال پر پڑے گا۔

وحدت کی ضرورت

اور ایک مقررہ حصّہ اپنے مال کا دے گا جیسے آج کے دِن بھی صدقۃ الفطر ہر شخص پر، غنی ہو، حرّ ہو یا عبد۔ غرض سب پر واجب ہے کہ وہ صدقہ دے تا کہ اَوروں کے لئے طہر کا کام دے اور نماز سے پہلے ایک مقام پر جمع کرے۔

اِس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ وحدت پیدا ہو۔ اِسلام کے ہر امر میں وحدت کی رُوح پھُونکی گئی ہے۔ جب تک وحدت نہ ہو اس پر اللہ کا ہاتھ نہیں ہوتا جو جماعت پر ہوتا ہے۔ میں درختوں کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ اگر ایک ایک پتہّ کہے کہ میں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں اور اپنے رَبّ سے مانگتا ہوں وہ مجھے سرسبز کر دے گا۔ کیا وہ الگ ہو کر سرسبز رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ مرجھا جائے گا اور اَدنیٰ سے جھونکے سے گر جائے گا اس لئے ضروری ہے کہ ایک شاخ سے اس کا تعلق ہو اور پھر اس شاخ کا کسی بڑی شاخ سے اور اس کا کسی بڑے تنے سے تعلق ہو جو جڑ اور اس کی رگوں سے اپنی خوراک کو جذب کرے۔ یہ سچی مثال ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا بیج لگاتا ہے تو جو شاخ اس سے الگ ہو کر بار آور اور ثمردار ہونا چاہے وہ نہیں رہ سکتی خواہ اُسے کتنے ہی پانی میں رکھو۔ وہ پانی اس کی سرسبزی اور شادابی کی بجائے اس کے سڑنے کا موجب اور باعث ہوگا۔ پس وحدت کی ضرورت ہے اِسی لئے صدقۃ الفطر بھی ایک ہی جگہ جمع ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عید سے پہلے یہ صدقہ جمع ہو جاتا اور ایسے ہی زکوٰۃ کے اموال بڑی احتیاط سے اکٹھے کئے جاتے یہاں تک کہ مُنکرین کے لئے قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے بھائیوں میں ابھی یہ وحدت پیدا نہیں ہوئی یا ہوئی ہے تو بہت کمزور ہے۔ تم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل اور احسان ہے کہ تم نے اس کو کامل صفات سے موصوف مانا ہے اور یہاں تک تم نے تو چند سے حظ اُٹھایا ہے کہ اگر کوئی غلطی سے مخلوق میں سے کسی کو ان صفات سے موصوف مانتا تھا تم نے اس کو بھی اس امام کے طفیل سے چھوڑا اور اَب تم پاک ہو گئے کہ مسیح کو خالق اور باری، محلّل، محرّم اور مُحی اور مُمیت اور عالم الغیب سمجھو۔ تو جیسے یہ امتیاز حاصل کیا تھا اب کیسی ضرورت تھی کہ پھر صحابہؓ کی طرح تمہارے سارے تعلقات اس شجرِ طیّبہ کے ساتھ ہوتے جس کے ساتھ پیوند ہو کر وہ تمام پھل لانے والے تم ہو سکتے تھے۔ مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا ہے جب مَیں کسی کو ایسے تعلقات سے باہر دیکھتا ہوں۔ دیکھو! تمہارے تعلقات، تمہارے چال چلن، شادی وغمی، حُسنِ معاشرت، تمدّن، سلطنت کے ساتھ تعلقات، غرض ہر قول وفعل آئندہ نسلوں کے لئے ایک نمونہ ہوگا۔ پھر کیا تم چاہتے ہو کہ رحمت اور فضل کا نمونہ تم بنو یا لعنت

کا۔ پس دعائیں کرو کہ تم جو اس پاک چشمہ پر پہنچے ہو اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے سیراب کرے اور عظیم الشان فضل اور خیر کے حاصل کرنے کی تمہیں توفیق ملے اور یہ سب توفیقیں اس وقت ملیں گی جب تمہارے سب معاملات ایک درخت سے وابستہ ہوں۔

پس ان سارے چندوں اور اغراض میں ایک ہی تنا اور جڑ ہو۔ پھر ایسی وحدت ہو کہ تمام دغا اور فریب کپٹ سے بَری ہو جاؤ۔ شاید تم نے سمجھا ہو کہ کسی کتاب کا نام کشتئ نوح ہے۔ نہیں۔ کچھ اغراض و مقاصد ہیں۔ کچھ عقائد اور اعمال ہیں۔ اس پر وہی سوار ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اس کی تعلیم کے موافق بناتا ہے۔ پھر ان سب کے بعد تقویٰ کی وہ راہ ہے جس کا نام روزہ ہے جس میں انسان شخصی اور نوعی ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ کے لئے ایک وقتِ معیّن تک چھوڑتا ہے۔ اب دیکھ لو کہ جب ضروری چیزوں کو ایک وقت ترک کرتا ہے تو غیر ضروری کا استعمال کیوں کرے گا؟ روزہ کی غرض اور غایت یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں میں اللہ کو ناراض نہ کرے اِس لئے فرمایا لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ۔

پھر جیسے پنجگانہ نمازیں ہر محلے میں باجماعت پڑھتے ہیں اور پھر جمعہ کی نماز سارے شہر والے اِسی طرح اردگرد کے دیہات والے اور کُل شہر کے باشندے جمع ہو کر عید کی نماز ایک جگہ پڑھتے ہیں اِس میں بھی وہی وحدت کی تعلیم مقصود ہے۔ غرض اسلام کے ہر رُکن میں ایک وحدت کو قائم کیا ہے پھر اس کو قائم رکھنے کے لئے خاص حکم بھی دیا لَا تَنَازَعُوۡا باہم کشمکش نہ کرو کیونکہ جب ایک کھچا کھچی کرتا ہے تو دوسرا بھی اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوَا ابگڑ جاتی ہے۔ جب یہ خود دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو چونکہ وہ بھی کبریائی الٰہی کا مظہر ہے اِس لئے تکبر کرتا اور وحدت اُٹھ جاتی ہے۔

اِسی لئے حکم دیا کہ نزاع نہ کیا کرو ورنہ پھسل جاؤ گے اور فرمایا صبر کرو۔ ایسا صبر نہیں کہ کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسری پھیر دو بلکہ ایسا صبر کرو اور عفو ہو کہ جس میں اصلاح مقصود ہو۔ سچے مومن بننا چاہتے ہو تو یاد رکھو لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیۡہِ مَا یُحِبُّ لِنَفۡسِہٖ۔

(بخاری۔ کتاب الایمان باب مِنَ الۡاِیۡمَانِ اَنۡ یُّحِبَّ لِاَخِیۡہِ مَا یُحِبُّ لِنَفۡسِہٖ)

اِسی وحدت کے قائم رکھنے کے لئے نمازوں میں یک جہتی تھی۔ مکہ کا وجود تھا اور اب اس وقت خدا کا کیسا فضل ہے اور کیسی مبارکی کا یہ زمانہ ہے کہ سب سامان موجود ہیں۔ مکالمہ الٰہی ہوتا ہے ایک مطاعِ مکۂ معظم موجود ہے اور اپنے عام چال چلن، مخلوق کے ساتھ تعلقات، معاشرت اور گورنمنٹ کے ساتھ اپنے معاملات کا نمونہ دکھانے سے قوم بنا رہا ہے اس لئے اب کوئی عذر نہیں رہ سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کہنے کی باتیں ہیں، کرنے کی نہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی اَمر و نہی ایسا نہیں دیا ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ ورنہ اس کی حکیم کتاب قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا (البقرہ: 287) باطل ہو گا اور وہ باطل نہیں ہے متقی اور خدا سے ڈرنے والا ایسی بات مُنہ سے نہیں نکال سکتا یہ صرف خبیث رُوح کی تحریکیں ہیں۔

اَلۡاِحۡسَانُ۔ اس کے بعد تیسری بات جبرائیل نے پوچھی ہے جس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ یہ ہے مَا الۡاِحۡسَانُ؟ احسان کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ایسا اخلاص اور احتساب ہو کہ تُو گویا اس کو دیکھتا ہے اور اگر اس درجہ تک نہ پہنچے تو کم از کم اپنے آپ کو اس کی نگرانی میں سمجھے۔ جب تک ایسا بندہ نہ ہو وہ دین کے مراتب کو نہیں سمجھ سکتا۔ پس ایسا دین کوئی سلیم الفطرت کہہ سکتا ہے کہ اس میں اِکراہ کی ضرورت ہے؟ ہرگز نہیں۔ لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ اِس وقت بھی ویسا ہی وقت ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ ہدایت کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ تجربے، مشاہدہ، سائنس، قویٰ کا نشوونما، وِجدان صحیح، فطری قویٰ، رُشد اور غیّ میں امتیاز کرنے کو موجود ہیں۔ رُشد کو اقتصاد بھی کہتے ہیں جو افراط اور تفریط کے درمیان کی راہ ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو خاص خاص مذاق میں بڑھے ہوئے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ اُن کو کھانے ہی کی ایک دھت ہوتی ہے اور اب وہ اس میں بہت ترقی کر گئے ہیں اور کرتے جاتے ہیں۔ بعض کو دیکھا ہے کہ بچپن میں یہ عادت ہوئی اور پھر بڑھتے بڑھتے بہت سی بداطواریوں کا باعث بن گئی۔ ایسا ہی لباس میں افراط کرنے والے، مکانات میں افراط سے کام لینے والوں کا یہ حال ہے۔ ایسا ہی بعض جمع اموال میں، بعض فضول خرچیوں میں بڑھتے ہیں۔ جب ایک کی عادت ڈال لیتے ہیں تو پھر وہ ہر روز بڑھتی ہے۔ غرض افراط اور تفریط دونوں مذموم چیزیں ہیں۔ عمدہ اور پسندیدہ اقتصاد یا رُشد ہے۔ یہی حال اقوال اور افعال میں ہے۔ اِس طرح پر ترقی کرتے کرتے ہم عقائد تک پہنچتے ہیں۔ بعض نے تو سوسائٹی کے اصول رسم و رواج سب کو اختیار کر لیا اور مذہب کا جزو قرار دے لیا اور بعض ایسے ہیں کہ ساری انجمنوں کو لغو قرار دیتے ہیں۔ غرض دُنیا عجیب قسم کی افراط اور تفریط میں پڑی ہوئی ہے۔ رُشد اور اقتصاد کی صراطِ مستقیم صرف اِسلام لے کر آیا ہے۔ بعض نادانوں نے اعتراض کیا ہے کہ اِسلام تو رُشد اور اقتصاد سکھاتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ کیوں کیا؟ مگر افسوس ہے کہ ان کو معلوم نہیں انہوں نے تو تیرہ سال تک صبر کر کے دکھایا اور پھر آخر آپؐ چونکہ کل دُنیا کے لئے ہادی تھے تو بادشاہوں اور تاجداروں کے لئے بھی کوئی قانون چاہیے تھا یا نہیں؟ اَب دیکھ لو کہ غیر

قوموں کی لڑائیوں میں کیا ہوتا ہے جب دشمن سے مقابلہ ہوتا ہے تو بعض اوقات عورتیں، بچّے، مویشی، کھیت سب تباہ ہوجاتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ صرف اِس لئے کہ مذہب نے ملک داری کا کوئی نمونہ اور قانون پیش نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ضرورت کی خود تکمیل کی ہے اور اسی لئے خانہ داری کے اصولوں پر الگ بحث کی ہے۔ ان لوگوں کو جو حیض و نفاس کے مسائل پر اعتراض کرتے ہیں غور کرنا چاہیے کہ معاشرت کا یہ بھی ایک جزو ہے۔

غرض ہماری شریعت جامع شریعت ہے جس میں انسان کے فطری حوائج، کھانے پینے سے لیکر معاشرت، تمدّن، تجارت، زراعت، حرفت، ملک داری اور پھر ان سب سے بڑھ کر خداشناسی اور روحانی مدارج کی تکمیل کی یکساں تعلیم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ یہی باعث ہے کہ اِسلام مکمل دین ہے۔ یہ ایک نیا قصہ ہے کہ اسلام ہر شعبہ اور ہر حصّہ میں کیا تعلیم دیتا ہے؟ چونکہ اِس وقت کتاب اللہ موجود ہے اور اس کا معلّم بھی خدا کے فضل سے موجود ہے اور اس کا نمونہ تم دیکھ سکتے ہو میں صرف یہی کہوں گا۔ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ۔

اس کی راہ رُشد کی راہ ہے اور اس کے خلاف خواہ افراط کی راہ ہو یا تفریط کی۔ اس کا نام غیّ ہے رُشد والوں کو مومن، متقی، سعید کہا گیا ہے اور غیّ والوں کو کافر، منافق، شقی۔ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ الآیہ۔ جو لوگ الٰہی حد بندیوں کو توڑ کر چلے گئے ہیں ان کو طاغوت کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہیں جن کو قرآن نے واضح کیا اور آنحضرتؐ نے دکھایا ان میں توفصم نہیں ہے۔ اَدنیٰ درجہ فصم ہے۔ اس سے بڑھے تو قصم پھر اس سے بڑھے تو قفصم۔ اللہ وہ اللہ ہے جو تمہاری دعاؤں کو سنتا اور تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔

الغرض یہ دین اور اس کا نتیجہ ہے قربِ الٰہی۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے تو چونکہ اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ہے اِس لئے یہ ظلمت سے نکلنے لگتا ہے اور اس میں امتیازی طاقت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ظلمت کئی قِسم کی ہوتی ہے۔ ایک جہالت کی ظلمت ہے۔ پھر رسومات، عادات، عدمِ استقلال کی ظلمت ہوتی ہے۔ جس جس قدر ظلمت میں پڑتا ہے اسی قدر اللہ تعالےٰ سے دُور ہوتا جاتا ہے اور جس قدر قرب حاصل ہوتا اسی قدر امتیازی قوت پیدا ہوتی ہے۔

نزول وصعود

پس اگر کسی صحبت میں رہ کر ظلمت بڑھتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ قربِ الٰہی کا موجب نہیں بلکہ بُعد حرمان کا باعث ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تو جس قدر انسان قریب ہوگا اسی قدر اس کو ظلمت سے رہائی اور نور سے حصّہ ملتا جاوے گا۔ اِسی لئے ضروری ہے کہ ہر فعل اور قول میں اپنا محاسبہ کرو۔ نیچے اور اُوپر کے دو لفظ ہیں جو سائنس والوں کی اصطلاح میں بھی بولے جاتے ہیں اور مذہب کی اصطلاح میں بھی ہیں۔ میں نے نیچے اور اوپر جانے والی چیزوں پر غور کی ہے۔ ڈول جوں جوں نیچے جاتا ہے اس کی قوت میں تیزی ہوتی جاتی ہے اور اِسی طرح پتنگ جب اُوپر جاتا ہے پہلے اس کا اُوپر چڑھانا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن آخر وہ بڑے زور سے اُوپر کو چڑھتا ہے۔ یہی اصل ترقی اور تنزّل کی جان ہے یا صعود اور نزول کے اندر ہے۔ انسان جب بدی کی طرف جھکتا ہے تو اس کی رفتار بہت سُست اور دھیمی ہوتی ہے لیکن پھر اس میں اس قدر ترقی کرتا ہے کہ خاتمہ جہنم میں ہوتا ہے یہ نزول ہے اور جب نیکیوں میں ترقی کرنے لگتا اور قربِ اِلیٰ اللہ کی راہ پر چلتا ہے۔ ابتداءً مشکلات ہوتی ہیں اور ظالم لنفسہٖ ہونا پڑتا ہے۔ مگر آخر جب وہ اس میدان میں چل نکلتا ہے تو اس کی قوّتوں میں ضرور ترقی ہوتی ہے اور وہ اِس قدر صعود کرتا ہے کہ وہ سابق بالخیرات ہوجاتا ہے۔ جو لوگ اِس اصل پر غور کرتے ہیں اور اپنا محاسبہ کرتے ہیں کہ ہم ترقی کی طرف جارہے ہیں یا تنزّل کی طرف۔ وہ ضرور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں مختصر الفاظ میں کہتا ہوں کہ اصل غرض اور منشاء دین کا سعادت اور شقاوت کی راہوں کا بیان کرنا ہے۔ ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، اللہ کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر ایمان، جزا و سزا پر ایمان ہو اور پھر اس ایمان کے موافق عمل درآمد ہو اور ہر روز اپنے نفس کا محاسبہ کرو۔

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ (البقرہ: 257) اسلام میں جبر نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی میں کھلا فرق ہوگیا ہے۔

ہمیں کتب مغازی میں (خواہ کیسی ہی ناقابلِ وثوق کیوں نہ ہوں) کوئی ایک بھی ایسی مثال نظر نہیں آتی کہ آنحضرتؐ نے کسی شخص، کسی خاندان، کسی قبیلے کو بزورِ شمشیر و اجبار مسلمان کیا ہو۔ سر ولیم میور صاحب کا فقرہ کیسا صاف صاف بتاتا ہے کہ شہر مدینے کے ہزاروں مسلمانوں میں سے کوئی ایک شخص بھی بزور و اِکراہ اسلام میں داخل نہیں کیا گیا۔ اور مکے میں بھی آنحضرت کا یہی رویّہ اور سلوک رہا۔ بلکہ ان سلاطینِ عظام (محمود غزنوی، سلطان صلاح الدین، اورنگ زیب) کی محققانہ اور صحیح تواریخ میں کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ کسی شخص کو انہوں نے بالجبر مسلمان کیا ہو۔ ہاں ہم ان کے وقت میں غیر قوموں کو بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر ممتاز و سرفراز پاتے ہیں۔ پس کیسا بڑا ثبوت ہے کہ اہلِ اسلام نے قطع نظر مقاصدِ ملکی کے اشاعتِ اسلام کے لئے کبھی تلوار نہیں اُٹھائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں، اسلام کے مخالفوں نے اکثر یہ طعن کیا ہے کہ آپ کا دین بزورِ شمشیر شائع ہوا ہے اور تلوار ہی کے زور سے قائم رہا۔ جن مؤرخین عیسائیوں نے آنحضرت صلعم کا تذکرہ یعنی لائف لکھی ہے آپؐ پر طعن کرنا انہوں نے اپنا

شعار کر لیا ہے اور ان کے طعن کی وجہ فقط یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے اپنے تئیں اور اپنے رُفقا کو دشمنوں کے حملوں سے بچایا۔ یہ سچ ہے کہ بعض برگزیدگانِ خدا دُنیا میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے ہیں اور سوءِ اتفاق اور گردشِ تقدیر سے خدا کی راہ میں اور اعلائے کلمتہ اللہ کی کوشش میں شہید ہوئے ہیں اور بعض لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے خللِ دماغ کی وجہ سے اِس امر کا دعوٰی کیا جس کی تکمیل ان سے نہ ہوسکی۔ الغرض مخبوط بھی گزرے ہیں اور مجذوب بھی ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی مجنونانہ حرکات کی سزا پائی مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مثلاً اگر حضرت مسیح مصلوب ہوئے یا مسیلمہ کذّاب اپنی کذّابیت اور مجذوبیّت کی سزا کو پہنچا تو معاذ اللہ آنحضرت صلعم کو بھی ان کی تقلید کرنا فرض تھا اور بغیر اپنی رسالت کے اتمام و تکمیل کے شہید ہو جانا لازم تھا؟

قوانینِ اسلام کے موافق ہر قِسم کی آزادی مذہبی اور مذہب والوں کو بخشی گئی جو سلطنتِ اسلام کے مطیع و محکوم تھے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ: 257) دین میں کوئی اجبار نہیں۔ یہ آیت کھلی دلیل اِس امر کی ہے کہ اسلام میں اور اہلِ مذاہب کو آزادی بخشنے اور ان کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے۔ اِسلام کے معنے صُلح کے ساتھ زندگی بسر کرنا، چین سے رہنا۔ کیونکہ یہ لفظ سَلم سے مُشتق ہے جس کے معنے صُلح اور آشتی کے ہیں۔ بعضے پادریوں کی دشمنانہ تحریر نے، میں سچ کہتا ہوں، آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ جبر و اکراہ سے اِسلام اور تصدیق قلبی کا حصول ممکن نہیں۔ قرآن کی دوسری سورہ کو جو مدینہ میں نازل ہوئی اور جس میں جہاد کا حکم ہوا ہے پڑھ لیجیئے اور غور کیجیئے آپ کا کلام کہاں تک سچ ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ: 257)۔ اس میں زبردستی نہیں اور حق و باطل واضح ہو گیا۔

اِسلام میں شرط ہے کہ آدمی صدق دِل سے باری تعالیٰ کی الوہیّت اور اس کی معبودیّت اور اس کے رسولوں کی رسالت وغیرہ وغیرہ ضروریاتِ دین پر یقین لاوے تب مسلمان کہلاوے اور ظاہر ہے کہ دلی یقین جبر و اِکراہ سے کبھی ممکن نہیں ہے۔ میں بڑی جرأت سے کہتا ہوں کہ حضور علیہ السلام اور ان کے راشد جانشینوں کے زمانے میں کوئی شخص جبر و اِکراہ سے مسلمان نہیں بنایا گیا۔ بلکہ محمود غزنوی اور عالمگیر کے زمانے میں بھی کوئی شخص عاقل و بالغ جبر سے مسلمان نہیں کیا گیا۔ دُنیا میں تاریخ موجود ہے صحیح تاریخ سے اِس الزام کو ثابت کیجیئے۔ میں نے زمانہ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے وقت اور محمود عالمگیر کی تاریخ کو اچھی طرح دیکھ بھال کر یہ دعوٰی کیا ہے۔ زمانہ رسالتمآب میں اور خلافتِ راشدہ میں صُلح اور معاہدہ امن کے بعد کل مذہب کے لوگ مذہبی آزادی حاصل کر لیتے تھے۔ خیبر کے یہود بحرین اور غسان کے عیسائی، حضرت خاتم الانبیاء اور خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کے وقت شام کے یہود اور عیسائی اسلام کی رعایا تھے اور اپنے مذہبی فرائض کی بجا آوری میں بالکل آزاد تھے۔ عالمگیر کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہندوستان کے پُرانے باشندے اپنی بت پرستی پر قائم دکھلائی دیتے۔ اگر عالمگیر کی لڑائیوں سے اِسلام پر الزام ہے تو عالمگیر نے تانا شاہ سے جو ایک سیّد تھا دکن کے ملک میں جنگ کی۔ پھر اپنے مسلمان باپ اور بھائیوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ مخفی نہیں۔ پس عالمگیری جنگ مذہبی جنگ کیوں خیال کی جاتی ہے؟ عالمگیر نے کبھی کسی ہندو کو تلوار اِس سبب سے نہیں لگائی کہ وہ ہندو تھا اور کبھی اس نے زبردستی ان کو مسلمان نہیں کیا۔ ان کی جو مذہبی عبادت اور رسومات جو قدیم سے چلی آتی تھیں ان کو نہیں روکا۔ محمود کی نسبت کہیں تاریخ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے اشاعتِ اسلام اور دعوتِ اسلام میں ہمت صَرف کی ہو۔ گجرات میں اِتنے دنوں تک پڑا رہا مگر ایک ہندو کو مسلمان نہ بنایا۔ اپنے بھائی مسلمان امیر اسمٰعیل سے جنگ کی۔ کیا وہ لڑائی بھائی کو مسلمان بنانے کے لئے تھی؟ اور ہند کے حملے تو راجہ جے پال نے خود کرائے جس نے محمود سے لڑنے میں ابتدا کی۔ وَاِلَّا محمود کا تو یہ منشاء تھا کہ تاتار کے بلاد کو فتح کرے نہ ہند کو۔

(حقائق الفرقان جلد اول صفحہ 390 تا 407)

۞۞۞

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جارہا ہے۔

ہماری اسلامی تحریکیں کب تک اندھیرے میں رہیں گی؟

تحریر: وحید مراد

لبرل ازم نے اسلامی تحریکیوں کو شکست دے دی وہ لبرل ازم کی تنقید پیش نہیں کر سکے یہ سب سے بڑی ناکامی ہے۔ میرے برادر محترم شاہنواز فاروقی صاحب نہایت صاحب ایمان، صاحب علم اور بہت متقی، عبادت گزار ہستی ہیں ان کے کالموں اور کتابوں سے راقم نے تہذیب مغرب اور فلسفہ مغرب کی تفہیم کے لئے بہت استفادہ کیا ہے۔ ان کا انداز بیان اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ قاری اس کے سحر میں بہتا چلا جاتا ہے، مگر گزشتہ چند ماہ سے ان کے کالموں میں اپنے سابقہ موقف سے انحراف واضح طور پر نظر آرہا ہے۔ جدیدیت سے لڑتے لڑتے وہ جدیدیت کے اثر میں آگئے ہیں۔

پاکستانی معاشرہ، عالم اسلام اور مغرب کی یلغار کے حوالے سے بھی ان کی باتیں بہت پرانی ہوگئی ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ پرانی معلومات کی بنیاد پر ہی کالم نگاری کر رہے ہیں اور جدید دنیا اور نئی تبدیلیوں سے ان کی آگہی بالکل نہیں ہے۔ 25 نومبر کے فرائیڈے اسپیشل میں جماعت اسلامی علاقہ وسطی کے ارکان کی تربیت گاہ سے ان کا خطاب اس کا تازہ ثبوت ہے۔ ذیل میں نہایت ادب واحترام کے ساتھ ان کے فکری التباسات کا جائزہ پیش کریں گے۔ جماعت اسلامی کا اصل کارنامہ کیا ہے، وہ اس حوالے سے کہتے ہیں، پاکستان میں یہ جو اسلام کا شور وغلغلہ ہے یہ سب مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی وجہ سے ہے پاکستان میں اب کوئی اسلام کے خلاف بات کرنے کے بارے میں مشکل ہی سے سوچ سکتا ہے اور اگر سوچے گا تو اس کی بڑی سخت مزاحمت ہوگی۔ (فرائیڈے اسپیشل 25 نومبر 2016ء)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہنواز فاروقی صاحب اندھیرے میں ہیں۔ پاکستان میں اسلام کا شور وغلغلہ جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد مسلسل کم ہوتا چلا گیا۔ پرویز مشرف نے لبرل پاکستان کا اعلان کیا، اپنے ہاتھوں میں دو پلوں (کتے کے بچوں) کو لے کر انہوں نے مصطفیٰ کمال کو اپنا ہیرو قرار دیا اور اس کے بعد میڈیا کے ذریعے، غامدی صاحب کے اسلام کے ذریعے اور لبرل، سیکولر طبقات کی حمایت کے ذریعے، جیو کے ذریعے حدود وتعزیرات کے قوانین کے خلاف جو زبردست مہم جوئی کی، یہ سب اسلام کے خلاف باتیں تھیں، اسلام کے خلاف مہم جوئی تھی، یہ سب کچھ پاکستان میں ہو رہا تھا، ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے اور شاہنواز فاروقی صاحب فرما رہے ہیں کہ اسلام کے خلاف بات کرنا مشکل ہے، کریں گے تو مزاحمت ہوگی۔

پرویز مشرف، جاوید غامدی، ان کے حلقے کے تمام مدبر، مفکر، خورشید ندیم، ڈاکٹر فاروق خان، وغیرہ وغیرہ سب اسلام کے خلاف کھلم کھلا باتیں کرتے رہے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی، مزاحمت تو دور کی بات ہے تمام اسلامی مذہبی جماعتیں پاکستان کے لبرل، سیکولر اسلام دشمن حکمران پرویز مشرف کے ساتھ اقتدار واختیار میں شریک رہیں۔ پرویز مشرف نے میڈیا کو جو آزادی دی اور یہ آزادی MMA اور مشرف صاحب کے اتحاد کے زمانے میں دی گئی۔ اس کا انجام یہ ہے کہ آج پاکستان کے 120 چینل صبح وشام اپنی مذہبی، غیر مذہبی نشریات کے ذریعے اپنے ڈرامے، پروگرام، ٹاک شوز، فلموں ثقافت سے اسلام کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ مہم چلا رہے ہیں اور شاہنواز فاروقی صاحب فرما رہے ہیں کہ کوئی اسلام کے خلاف بات نہیں کر سکتا۔۔۔ عریانی، فحاشی کے ذریعے کیا اسلام کے حق میں بات ہو رہی ہے؟ ٹی وی ڈراموں میں تمام مذہبی اقدار، قرآن وحدیث کے احکامات کے ذریعے عورت اور مرد کی مساوات کے نام پر تمام اسلامی اقدار، روایات، احکامات کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جا رہا ہے اور شاہنواز فاروقی صاحب کہہ رہے ہیں کہ کوئی اسلام کی مخالفت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاہنواز صاحب اس ملک میں اسلام کے خلاف ہونے والے کاموں اور لبرل لوگون کے کارناموں سے بالکل بے خبر ہیں مثلا سپریم کورٹ کے دو اہم فیصلے جنہوں نے پاکستان کی نام نہاد اسلامی دستوریت کا نقاب بھی نوچ کر پھینک دیا ہے۔ شاہنواز صاحب اس سے واقف نہیں۔

علماء، مذہبی مفکرین، مذہبی سیاسی جماعتیں 1973 سے اس مشترکہ متفقہ التباس کا شکار تھیں کہ پاکستانی ریاست نے 1973 کے دستور میں اسلام کو بالاتر قانون تسلیم کر کے کلمہ پڑھ لیا ہے حالانکہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کلمہ فرد پڑھتا ہے

ریاست نہیں۔۔۔قبر میں جواب دہ ریاست نہیں ہوتی خلیفہ جواب دہ ہوتا ہے۔۔۔کلمہ ہمیشہ فرد،نفس پڑھتا ہے کوئی تجریدی وجود abstract entity نہیں پڑھتی۔ یہ محض خطابت تھی لہٰذا خطابت کا اثر زیادہ دیر تک نہیں چلتا۔۔۔

جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں اس خطابت کو نقطہ عروج اس وقت ملا جب ضیاء صاحب نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے قرارداد مقاصد کو جو آئین کے دیباچے کا حصہ تھی آئین سے ماوراء ہی نہیں آئین پر برتر اور حاکم بنا دیا۔اب قرارداد مقاصد super constitutional ہوگئی۔مذہبی حلقے حسب معمول شاہنواز فاروقی صاحب کی طرح خوشی سے نہال ہوگئے کہ اب پاکستان کا آئین سوفی صد اسلامی ہوگیا کیونکہ قرارداد مقاصد کو آئین کی تمام سیکولر،لبرل،ملحدانہ شقوں پر برتری حاصل ہوگئی۔لہٰذا اب آئین کی ہر سیکولر لبرل شق اصول کی تشریح اسلام کی روشنی میں ہوگی لہٰذا پورا قانون ہی اسلامی ہو جائے گا۔ان سادہ لوح لوگوں کو اکیسویں صدی میں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ آئین کبھی اسلامی نہیں ہوسکتا۔اسلامی صرف شریعت ہوتی ہے وہ قانون نہیں ہوتی۔قانون اس کا حصہ ہوسکتا ہے اس کے نفاذ اور نفوذ کے لئے قوانین،پارلیمنٹ،آرڈیننس،ایکٹ کی ضرورت نہیں ہوتی یہ تمام جدید آئینی دستوری سیکولر،لبرل ادارے ہیں جن کے سانچے میں شریعت کو ڈالتے ہی ریاست اور اس کے قوانین بظاہر اسلامائز ہوتے جاتے ہیں مگر اسلام اور خود ریاست اور ریاستی قوانین مذہبی ہونے کے باوجود اصلاً سیکولر ہو جاتے ہیں۔

اسلامی شریعت۔۔۔صرف شریعت ہوتی ہے ایکٹ،آرڈیننس،ریگولیشن نہیں ہوتی۔شریعت نہ آئین ہے نہ دستور ہے۔۔۔دستور آئین،فیڈرلسٹ پیپرز سے نکلتے ہیں یہ کبھی مذہبی نہیں ہوسکتے لہٰذا آئین اور جدید ریاست کبھی مذہبی نہیں ہو سکتے۔ان بے چاروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آئینی ترمیم حتمی،مستقل نہیں ہوتی،آئینی شقیں بھی مطلق نہیں ہوتیں اکثریت جب چاہے ان کو تبدیل کرسکتی ہے،منسوخ کرسکتی ہے،ان پر تنقید کرسکتی،اعتراض اٹھا سکتی ہے لہٰذا جب اسلام کو جدید سیکولر قانون سازی کے طریقے سے پاکستانی ریاست میں آرڈیننس اور ایکٹ کے ذریعے نافذ کردیا گیا تو پارلیمنٹ کی منظوری لازمی ہوگئی،پارلیمنٹ جو بھی قانون بناتی ہے وہ نہ حتمی ہے نہ مطلق،وہ مقدس۔

❁❁❁

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی،معاشی،......ہو۔ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ.....اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

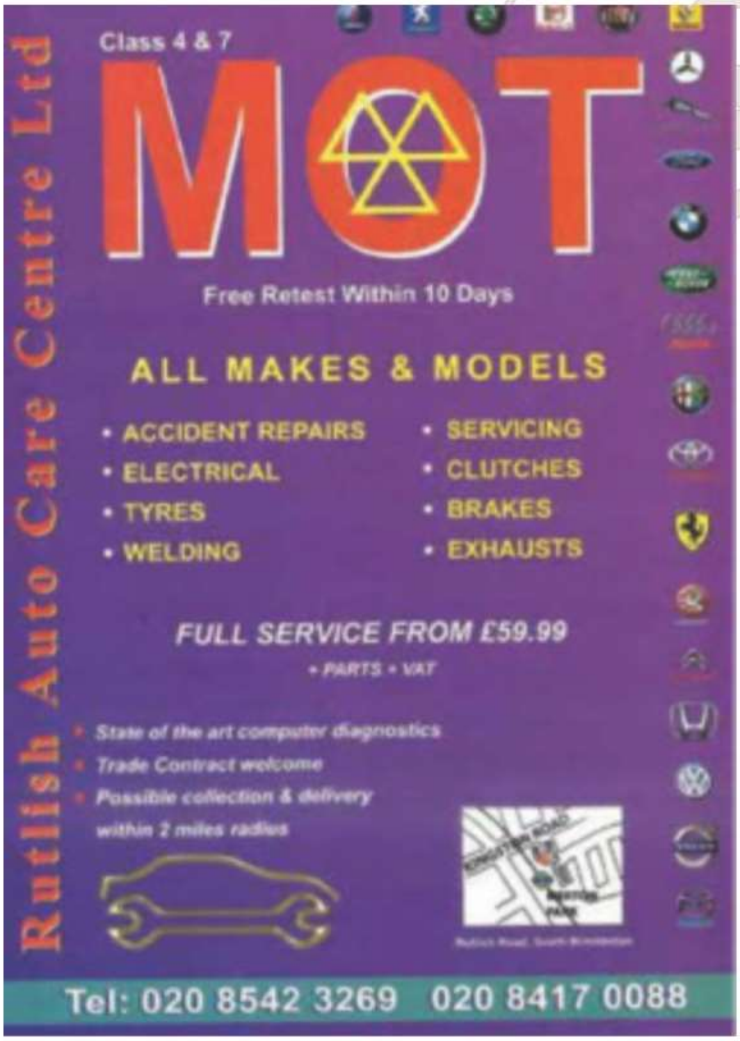

مسلمانوں کے عروج وزوال میں نظریۂ علم کا کردار

تحریر: پروفیسر محمد حسین چوہان

(قسطِ اول)

شعبہ بین المذاہب

مسلمان اور دیگر اقوام کی فکری ساخت اور بنیاد میں بنیادی فرق نظریۂ علم کا ہے۔ مسلم فکر میں عقیدہ و ایمان بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ جب کہ باقی مذاہب و اقوام میں عقیدے کو علم کے دائرۂ کار میں شامل نہیں کیا جاتا۔ ان کے نظامِ فکر میں تجربہ ہی علم کی بنیادی شرط ہے۔ جب تک مشاہدہ تجربی تصدیق کا حامل نہیں بن جاتا، علمی استناد کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔ باقی دیگر سماجی عُلوم کو سائنس کا رتبہ حاصل نہیں جو تصدیقی سائنسی عُلوم کو حاصل ہے۔ سماجی عُلوم فطری عُلوم کا منطقی تسلسل واظہار ہیں۔ رہا مسئلہ نفسی و مابعدُ الطّبعیاتی عُلوم کا تو یہ کسی کی انفرادی سوچ اور عقیدے پر منحصر ہے۔ ان کو مفادِ عامہ اور افادیت پسندی کے لیے عمومیت اور لازمیّت کا رنگ نہیں دیا جاسکتا۔ ساتھ ساتھ افادی علم غیر یقینی بھی ہے۔ مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس تبدیلی کی لہروں میں غوطہ زن ہو کر معنی کے نئے جہان تلاش کرنے ہوتے ہیں۔ جس سے انسانی ضروریات وسہولیات کے نئے امکان پیدا ہوتے ہیں۔ جدید تہذیب کی بنیادیں عقیدے کے برعکس، تجربی و افادی عُلوم پر قائم ہیں۔ جن کی تصدیق حواس اور عقل وشُعور بھی کرتے ہیں، جیسے انسان نے فطری جبر اور قدرتی آفات پر قابو پایا ہے اور سماجی مسائل حل کیے ہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں میں روحانیت اور مثالیّت پسندی ایک انفرادی سوچ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

اس نظریۂ علم کے تحت روحانی بالیدگی اور انفرادی خودی کی تعمیر وتشکیل سماجی مسائل کے حل کے بغیر ممکن نہیں اور انفرادی خودی، اجتماعی خودی کی ترقی کے بغیر بھی پنپ نہیں سکتی۔ قوتِ ارادی کے چراغ سے سارے ماحول کو روشن نہیں کیا جاسکتا، جب تک سماج کی اجتماعی حرکت میں جوہری قوتیں مسلسل گردش نہ کر رہی ہوں۔ ورنہ تناقصات و تضادات کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ مثالیت پسندی کے ناقابلِ فہم قضیّوں کو انسانی فکر نے علم وتجربے کی روشنی میں حل کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں، اور عقیدہ وایمان کو الگ رکھ کر علمی سفر کو تیز تر کیا ہے۔ اگر عقیدے کی عینک سے علم کو پرکھنے کی کوشش کی جاتی تو علم وعقیدہ مسائل کی دلدل میں ہی گُتھم گتھا ہوتے اور انسانی تہذیب گھٹنوں کے بل چل رہی ہوتی۔ اگر اسلامی نظامِ فکر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کی فکری ساخت موجودہ نظامِ فکر سے مختلف واقع ہوئی ہے۔ اس میں نظریۂ علم کے حوالے سے جامعیت نظر آتی ہے۔ ہم اسلامی فکر کو اس کی تنگ دامانی کا طعنہ نہیں دے سکتے کہ سائنسی وتجربی عُلوم کے حصول کی اس میں ترغیبات نہیں ہیں۔ مگر عقیدہ و ایمان اس کی بنیادی شرائط ہیں۔ الٰہیات اور غیب پر ایمان لانا لازمی ہے۔ اس کے بغیر انائے مطلق سے انفرادی خودی اپنا حقِّ تخلیق ادا نہیں کرسکتی۔ حقیقتِ مطلقہ سے ربط قائم رکھتے ہوئے بطورِ نائب وہ اپنا عملی فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ عملی وتجربی دنیا میں وہ الٰہیات سے بھی جڑی رہتی ہے، جہاں عقیدہ اور عمل وتجربہ باہم مل کر ایک نظریۂ علم کی بنیاد رکھتے ہیں۔ سائنسی و تجربی عُلوم کی تحصیل میں امکانات کی دنیا وسیع ہے۔ ایک نئی آن وشان کا ظہور مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ تیقّن کے ساتھ عدم تیقن قائم رہتا ہے۔ تشکیک کے دَر وا رہتے ہیں۔ انسانیت کی بقاء اصلاح اور فائدے کے لیے علم کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اسلام کی اساسی فکر میں فائدہ مند علم کو بہترین علم قرار دیا گیا ہے۔ علمِ کائنات کے ساتھ ساتھ علمِ نفس پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ جب کہ جدید تہذیب میں علمِ نفس کو اضافی قرار دیا گیا ہے جو معاشی وسائنسی علم کے زیرِ اثر پروان چڑھتا ہے۔ اس بناء پر جدید فکر میں تجربی وافادی عُلوم ہی انسانی بقاء وسالمیت کے لیے کافی ہیں۔ انسانی احتیاج وضروریات کی تشفی کے بغیر انسانی نفس کی تسکین بھی نہیں ہوسکتی۔ عقیدے کی پختگی اور مصمم ارادے تخلیقی عمل کو سست اور شک وشبے میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ تخلیقی عمل کو مکمل انفرادی آزادی اور اجتماعی تعاون درکار ہوتا ہے۔ اس کے بغیر فرد کا کوئی بھی تجربہ بطریقِ احسن پایۂ تکمیل تک پہنچ نہیں سکتا۔ الٰہیاتی فکر میں ذاتی تجربے کو الُوہی رضا کا پابند ہونا پڑتا ہے، جب کہ جدید تہذیب کے فرزند کو علم بہ راہِ علم تک محدود رہ کر اپنی منزل کے سفر کو مختصر کرنا ہوتا ہے تاکہ نتائج جلدی حاصل ہوسکیں۔ عیسائیت اور دیگر مذاہب میں بھی تخلیقیت اور انفرادی آزادی کی راہ میں بھی الُہیّت آڑے آتی رہی، اور اسلام کی عمل وتجربی فکر بھی اس متصوفانہ اسلوب سے دامن بچا نہیں سکی۔ اسلامی نظریۂ علم کے دائرۂ کار میں وسعت پائی جاتی ہے۔ یہ علم الابدان اور علم الادیان دونوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

مادی و نفسی دونوں مسائل کو بیان کرتا ہے۔ الٰہیات اس کی سرشت میں ہے۔ روحانیت کو مادیت پر تفوق حاصل ہے۔ طبعی عُلوم تغیر پذیر اور غیر یقینی ہیں جب کہ الٰہیات ناقابلِ گرفت ہونے کے باوجود عقیدہ وایمان کا درجہ رکھتا ہے۔

اس بناء پر مادی عُلوم کی تحصیل کو الُوہیت کے ساتھ ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ جس میں کنفیوژن، اور بعض اوقات تحصیلِ علم میں تعطل وسست رفتاری پیدا ہوجاتی ہے، کیوں کہ

علمی کاوشوں کو دوسری جانب سے سندِ جواز حاصل کرنی پڑتی ہے۔

تاریخِ اسلام کے ہر دور میں عقل وعقیدے کی آپس میں محاذ آرائی دیکھنے کو ملی۔اس انتشار کا بڑا سبب فکرِ اسلامی میں تضاد کے برعکس اس کی تعبیر تھی۔علماء،حکماء اور صوفیاء کے مابین نظری اختلافات نے افادی سائنسی علم کی ترقی کے عمل کو روک دیا۔علم کی سرپرستی وترقی کے لیے معاون قوتوں،یعنی اربابِ بست وکشاد کو نہ ہی ترجیحی بنیادوں پر ترغیب دی گئی اور نہ ہی آزاد علمی رجحانات کے فروغ کے لیے ماحول سازگار بنایا گیا۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ فطرت کی تسخیر کرنے کے برعکس باطن پرستی کی طرف رجحان میں اضافہ ہوا۔ایجادات وانکشافات کرنا تو دور کی بات،کسی بھی نئی ایجاد کو قبول کرنے میں ان کو کئی عشرے لگ گئے۔یہ حال تمام مکاتب فکر کا ہے۔یہ علم واخلاق کا باہمی تعلق ڈھونڈتے رہے۔ان کو اس چیز کا احساس نہیں ہوا کہ ہر نئی اختراع وایجاد فی نفسہٖ مسلمان ہوتی ہے،یعنی انسانی احتیاج وضرورت کو پورا کرتی ہے۔

اشیاء کے تصرف میں علم اخلاق ونفس فیصلہ کرتے ہیں۔ایجاد واختراع میں محنت، تحقیق اور ترغیب کا عمل دخل ہوتا ہے۔اور ریاست کی آشیرباد شامل ہوتی ہے۔مگر مسلم دینی مکاتبِ فکر نے اس معاملہ میں حوصلہ شکنی کا مظاہرہ کیا۔عُلوم کی تحصیل وفرضیت کو بھول گئے کہ بہ قول حدیثِ نبویؐ،حکمت اور دانائی مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہے جہاں سے بھی وہ ملے حاصل کرلو۔علم کے حصول وفرضیت اور ترغیب پر کئی احادیث اور قرآنی احکامات ہیں۔ارشادِ نبویؐ ہے،علم حاصل کرو،کیوں کہ جو شخص راہِ حق میں علم حاصل کرتا ہے،وہ ایک کارِتقویٰ انجام دیتا ہے۔جو شخص اس کا ذکر کرتا ہے،وہ خدا کی حمد وثنا کرتا ہے،جو شخص اس کی جستجو کرتا ہے،وہ خدا کی عبادت کرتا ہے،جو شخص علم کو دوسروں تک پہنچاتا ہے،وہ خیرات تقسیم کرتا ہے۔جو شخص ایسے لوگوں کو،جو علم کے اہل ہیں،علم بخشتا ہے وہ ایک عمل صالح کرتا ہے۔علم جس کے پاس ہو اس کو اس امر کی استعداد عطا کرتا ہے کہ ممنوعہ اور غیر ممنوعہ چیزوں میں امتیاز کرسکے۔وہ ہمارے لیے آسمان کی شمعِ راہ ہے۔وہ صحرا میں ہمارا رَہبر،خلوت میں ہمارا انیس اور بے یاری کے عالم میں ہمارا یار ہے۔وہ خوشی میں ہمیں راہِ راست پر رکھتا ہے۔اور غم میں ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔وہ دوستوں کی بزم میں ہماری زینت ہے اور عرصہ رزم میں حربۂ دفاع۔علم کی مدد سے خدا کا بندہ نیکی کی بلندیوں کو پالیتا ہے،شرف کے مدارج حاصل کرتا ہے،اس دنیا میں بادشاہوں کا ہم صحبت بنتا ہے اور دوسری دنیا میں سعادتِ ابدی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

عالم کی رُوشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

صانعِ حقیقی کے کاموں پر ایک گھنٹے کا تأمل ستر سالوں کی عبادت سے بہتر ہے۔علم و حکمت کا سبق سننے میں ہزار شہیدوں کی نماز جنازہ پڑھنے،یا ہزار راتیں قائم الصلوٰۃ رہنے سے زیادہ ثواب ہے۔سائنس کی باتوں کا سننا اور سائنس کے سبقوں کا دل نشین کرنا مذہبی ریاضتوں سے بہتر ہے۔جو شخص علم کو زندگی بخشتا ہے وہ کبھی نہیں مرتا۔

اس سے زیادہ جامع علم کی تعریف وترغیب کیا ہوسکتی ہے۔اس میں کسی مخصوص شعبۂ علم کا حصول مراد نہیں ہے،بلکہ غیر مشروط طور پر تمام عُلوم وفنون کو حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔اس میں وسعت وکشادہ دامنی بھی ہے اور بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو طبعی و سائنسی عُلوم کی تحصیل سرِفہرست آتی ہے،کیوں کہ دینی عُلوم تو مسلمانوں کی جماعت میں پہلے سے موجود تھے۔انھوں نے دیگر کلچرز اور اقوام سے ہی کچھ حاصل کرنا تھا۔جس میں جدوجہد اور کاوش سے کام لینا تھا۔قرونِ وسطیٰ تک مسلم حکم رانوں نے دوسری اقوام سے کسبِ فیض کیا۔علم وتجربہ کو تحصیل علم کے لیے ضروری قرار دیا۔

افلاطون کے نظریہ کے برعکس ارسطو کے تتبّع میں تجربہ ومشاہدہ کو اپنایا گیا۔مسلم سائنس دانوں نے علم کی دنیا میں ایک نئی تہذیب کی بناء ڈالی۔آٹھویں صدی تا بارہویں صدی تک سائنسی ومعاشرتی عُلوم میں ان کا ڈنکا بجتا رہا۔سپین،بغداد اور وسطِ ایشیاء میں جو تہذیبی ومعنوی کلچر کی بنیادیں پڑیں اس میں دوسری اقوام سے حاصل کیے گئے علمی نظریات کا بڑا عمل دخل ہے۔

یونانی عُلوم ونظریات کی تحصیل وفروغ میں مسلمانوں کا بڑا کردار ہے۔

پروفیسر جرمانوس کے مطابق:

عربوں کی یہ تہذیب انتخابی،یعنی خذ ماصفا ودع ما کدر کے اصول پر مبنی تھی۔

انھوں نے ہر اس چیز کو منتخب کیا اور اپنایا،جو قرونِ وسطیٰ میں ایک حد تک حریت پسندانہ رجحان کی حامل تھی۔دوسری اقوام سے عُلوم وفنون علمی وسائنسی نظریات،نظم ونسق کے اصول،قواعد وضوابط کی تحصیل کا یہ سلسلہ شد ومد کے ساتھ جاری وساری رہا۔جنگی اصولوں میں جاسوسی کے ذریعے دوسروں کی معلومات اور جنگی حربے حاصل کیے گئے۔

طبعی وسائنسی عُلوم میں یونان،ایران،شام اور ہندوستان سے کسبِ فیض کیا۔

آپ ﷺ کے وصال 632 کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور 1258 تک ایک شان دار علمی وسائنسی تہذیب سپین سے لے کر چین و ہندوستان کی سرحدوں تک قائم ہوگئی۔شمالی عرب کے ساحلِ سمندر سے لے کر ہندوستان،انڈونیشیا،سنگاپور کے ذریعے چین تک مسلمانوں کے تجارتی بیڑوں نے پانیوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔تجارت اور دولت کی فراوانی نے وہ آسودگی بخشی جسے عُلوم و فنون کی تحصیل وترقی ممکن ہوئی۔چونکہ سائنسی عُلوم کی ترقی میں حکومتوں کا کلیدی کردار

ہوتا ہے۔حکومتوں کی پشت پناہی کے بغیر تجربی عُلوم کی تحصیل ناممکن ہوجاتی ہے۔صرف خانقاہی تصوف ہی فروغ پا سکتا ہے۔اگر چہ اسلامی تعلیمات پر گزشتہ ادیان اور کلچرز کے اثرات موجود تھے۔توحیدی تعلیمات ایک جیسی تھیں۔یونانی فلسفہ کے افکار سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا،مگر عرب خارجی زندگی،یعنی فطرت کو پسند کرتے تھے۔اس بناء پر انھوں نے باطن پرستی اور تصوف کے برعکس تجربات ومشاہدات کو علمی حصول کے لیے اختیار کیا۔پہلی ڈیڑھ صدی میں مسلم فکر پر فلسفیانہ افکار کی چھاپ نہیں تھی۔ایمان، خلوص،عفوودرگذر،اخلاص،خشوع وخضوع جیسی صفات غالب تھیں۔جس میں عبادت و ریاضت اوراَکلِ حلال ومشقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

مگرعلم کی چنگاری ان کے سینوں میں موجودتھی۔امیر معاویہ کے پوتے نے یونانی آگ کے گولے کااستعمال دشمن کے جہازوں کوشکست دینے کے لیے کیا۔اور یہ ترکیب انھوں نے کسی شخص کے ذریعے یونانیوں سے حاصل کی۔بعدازاں عراق کے کنوؤں سے آتشیں مادہ حاصل کرکے آگ کے گولے دشمن کے لشکروں پر پھینکے گئے اورفتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔یعنی اس دور میں ایمان وعقیدے کی پختگی کے ساتھ تجربی عُلوم کی تحصیل کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔760 بغداد میں عباسی حکومت کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی علم وسائنس اور دیگرعُلوم میں انقلاب خیز ترقی کا دورشروع ہوا۔جس میں عقلی و سائنسی عُلوم کو بہت ترقی نصیب ہوئی۔مامون فلسفہ وسائنس کے خود بھی بہت بڑے شیدائی تھے۔ان کے دربار میں بڑے بڑے حکماء موجود رہتے تھے۔خود بھی عقلیت پرست تھے۔دوسری طرف معتزلہ کی تحریک نے بھی جلا بخشی۔معتزلہ کے نظریات جوبہ براہ راست یونانی فلسفے سے مستعار تھے،علم کی ترقی میں بڑے معاون ثابت ہوئے۔معتزلہ کی تعلیمات اورعباسیہ خاندان کی کاوشوں سے عقلیت اور تجربیت کوفروغ ملا۔سپین اور بغداد دو ایسے علمی مراکز تھے جہاں تصنیف وتالیف اور یونانی کتب کے تراجم کیے گئے اور یہ کام سرکار کی سرپرستی میں ہوتا تھا۔زراعت وصنعت میں وسیع ترقی ہوئی۔ایران کا بہترین کپڑا یورپ کی خواتین وحضرات بڑے شوق سے زیبِ تن کرتے تھے۔کپاس اوردرختوں کی چھال سے بہترین کاغذ کی تیاری شروع ہوئی۔اعلیٰ قسم کے مسالے اورخوشبویات کی دنیا بھر میں طلب ہونے لگی۔سائنس وفلسفہ کی کتب کے تراجم سے یورپ بیدار ہونے لگا۔طب کی دنیا میں نئی نئی دریافت اورنسخوں نے مردہ جسموں میں جان بخش دی۔رواداری اور روشن خیالی نے عُلوم وفنون کی ترقی کے راستے کوآسان کر دیا۔بقول محمد زکریا ورک،آٹھویں صدی سے تیرہویں تک اسلامی تہذیب نے جن جلیل القدر عالموں کوجنم دیا،ان میں سائنسی عُلوم میں جابر بن حیان، الکندی،ابن بیطار،ابن الہیثم،میڈیسن میں زکریا رازی،ابن سینا،الزہراوی،ابن اظہر،ابن ظہر،ریاضی اورعلم ہیت میں الخوارزمی،ثابن ابن قرات،عمرخیام،ابوالوفا، نصیرالدین الطوسی؛فلسفہ میں الفارابی،ابن سینا،الغزالی،ابن رشد،فخرالدین رازی،علم تاریخ میں الطبری،ابن اثیر،ابن خلدون؛جغرافیہ میں المسعودی،الادریسی،ابن حوقل کے نام قابلِ ذکرہیں۔مغربی درس گاہوں میں ان عالموں کو پڑھایا جاتا تھا۔علم وفکر میں جتنی آزادی اورحکومتی سرپرستی ہو،وہ اتنا ہی تیزی سے پھلتا پھولتا ہے۔کوئی بھی انسانی معاشرہ علمی ترقی کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔جمہوری آزادیاں اورصاحبِ بصیرت حکم رانوں کے بغیر علمی معراج حاصل نہیں ہوسکتی۔مسلمانوں کی اتنی معنی خیز تہذیب وترقی میں بنیادی کردارعلم کا تھا اور وہ علم بلاجھجک انھوں نے غیراقوام سے مستعار لیا اوراس میں اضافے بھی کیے۔وہ علم کوانسانیت کی مشترکہ میراث سمجھتے تھے۔وہ جتنے مُوجد تھے اتنے ہی نقال بھی تھے۔علم میں نقل واکتساب بھی باعث خیر ہوتا ہے۔جس طرح آج چینی قوم کاعُلوم وفنون کی ایجاد میں حصہ کم ہے،مگر کسبِ فیض میں زیادہ ہے اوراسی کسبِ فیض کے نتیجے میں دنیا کی ایک عظیم طاقت کا دم بھر رہی ہے۔علم کو مذہب کی سرپرستی سے آزاد کر دینے سے تیزی سے فروغ پاتا ہے،کیوں کہ مذہبی کٹر پسندی نے ہمیشہ اس کی تحصیل میں روڑے اٹکائے ہیں۔جب کہ فکرِ اسلامی اس کے لیے تنگیِٔ داماں کا کبھی مظاہرہ نہیں کرتی،مگراس کی مختلف تعبیریں انسانی عقل کوزنجیریں پہنا دیتی ہیں۔

سقوطِ بغداد تک ایک بہترین تجربی وسائنسی تہذیب کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔دین کی متحرک فکر کی جلوہ نمائیاں ہرشعبۂ حیات میں موجودتھیں۔یونانی،ایرانی اور ہندی عُلوم منظم شکل میں تہذیب کے سانچے میں ڈھل چکے تھے۔علم وعمل کا باہمی تعلق قائم ہو چکا تھا۔تھیوریاں پریکٹس میں ڈھلنے کے لیے بے تاب تھیں۔سائنسی عُلمائے فکرِ اسلامی کی نمائندگی کررہے تھے۔اس عہد کا ہرسائنس دان بیک وقت فلسفے اوردین کا عالم بھی ہوتا تھا۔دینی وفقہی عُلوم اپنا الگ کردارادا کر رہے تھے۔یہ انتخابی تہذیب،شہد کی مکھی کی طرح ہر پھول سے مٹھاس چوس لیتی تھی۔عربوں کا کہنا تھا کہ جواچھی چیز ملے اس کو لے لو اور بری کوترک کردو۔علمی نظریات میں کسی مخصوص دائرۂ کار کے پابند نہیں تھے۔ان کے نظامِ فکر میں معنی خیزی وترقی پسندی بنیادی جوہر کی حیثیت رکھتے تھے۔سائنسی طرزِ فکر وطرزِعمل نے تکثیری کلچر کوفروغ دیا۔ایمان وایقان کے ساتھ عقلیت وتجربیت کی تجسیم مثالی تھی۔انسان کی بطور انسان شناخت ممکن ہوئی۔مساوات کے نظریہ نے ہر رنگ ونسل کے درمیان امتیاز مٹا دیے۔رواداری نے علم کو پنپنے اور پھیلنے کے مواقع فراہم کیے۔اسلامی فکر میں اتنی قوت ضرورتھی کہ خلافت کی ملوکیّت میں تبدیلی اور باہمی قبائلی انتشار وعصبیت کے باوجود علم کی قندیلیں اصحاب وخانوادۂ رسول ﷺ نے جلائے رکھیں۔

شعبہ گوشۂ ادب

اردو ادب میں ناول کا ارتقاء اور آج کے ناول نگار

تحریر: نعیم بیگ

ادبی حلقوں میں یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ کیا اردو ادب میں ناول کی پیش رفت تھم گئی ہے؟ جب ہم اس سوال کا عمیق جائزہ لیتے ہیں تو تصرفاتی سطح پر دو ضمنی سوال بھی اٹھ جاتے ہیں۔ اولاً کیا اردو ادب کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں گزشتہ چند دھائیوں سے اُسلُو بیاتی، یا موضوعاتی سطح پر کوئی بنیادی مسئلہ درپیش تو نہیں؛ یا ثانیاً جب ہم اردو ادب اور اس میں لکھے جانے والے فن پاروں کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب وہ تمام ادب جو اردو زبان کے حوالے سے لکھا جا رہا ہے اس میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ عالمی سطح کے وہ بڑے ملک بھی شامل ہیں جہاں اردو ادیب بستے ہیں۔ تاہم جہاں تک ان فن پاروں کی پبلشنگ، یا اشاعت کا کام ہے وہ انھی دو ممالک یعنی ہندوستان اور پاکستان میں ہو رہا ہے۔ جہاں نقاد انھی سانچوں میں ڈھلے فن پارے تلاش کرتے ہیں جو نظریاتی طور پر بظاہر جدیدیت کی نمائندگی کرتے ہوں، لیکن اپنی تاثیر میں کنزرویٹو، یا یوں کہیے کہ وہی روایتی انداز لیے ہوئے ہوں۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ سیاسی طور پر ناسازگار حالات نے اردو ادب کے ان دو سرے چشموں (پاکستان و ہندوستان) پر ہر دو طرفہ پابندیاں اس قدر لگا رکھی ہیں کہ ترسیلِ معلومات و کتب اور ان کی قاری تک فراہمی کو دشوار ترین بنا دیا گیا ہے۔ گاہے گاہے کوئی خبر پہنچ جاتی ہے ورنہ تفصیل سے پاکستان والوں کو یہ خبر تک نہیں ملتی کہ ہندوستان میں ادبی رجحانات کیا ہیں اور ادب کس سمت میں سفر کر رہا ہے۔ اس طرح ہندوستان میں بھی یہ خبر ذرا کم پہنچتی ہے۔ چند ایک جریدے ہیں جو باعثِ تقویت ہیں اور تھوڑا بہت جو کچھ یہاں پہنچتا ہے انھی ادبی آن لائن جریدوں کے توسط سے پہنچتا ہے۔ اب انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا فورمز اور ورچوئل ادبی جرائد کی معلومات نے کسی حد تک اس مسئلے کو حل تو کیا ہے لیکن مکمل آگہی ابھی بہت دور ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اردو ناول کی پیش رفت کیا تھم گئی ہے؟ میرا نہیں خیال ایسا ہے۔ وہی بات کہ گذشتہ ایک سال میں ہمارے ہاں، یعنی پاکستان میں، اردو ناول جنھیں اردو ادب میں مقام مل رہا ہے وہ تعداد میں کچھ زیادہ تو نہیں۔ سال بھر میں یوں تو کئی ایک ناول سامنے آتے ہیں لیکن جن سنجیدہ ناولوں کو نقد و نظر کے احباب خاطر میں لاتے ہیں یا پرنٹ میڈیا ان پر گفتگو کرتا ہے وہ چند ایک ہی ہوتے ہیں۔ جیسے میرزا اطہر بیگ کے ناول غلام باغ اور حَسن کی صورتِ حال: خالی جگہ پر کریں وغیرہ۔

اس سے پہلے انتظار حسین کا ناول بھی آ چکا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ناولوں کی پیش رفت تھم گئی ہے، بیرون اَز قیاس ہے ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ رفتار سست ہو چکی ہے۔ اقبال حسن خان لکھ رہے ہیں۔ عاطف علیم لکھ رہے ہیں۔ خاکسار کا ایک حالیہ اردو ناول ڈئیوس، علی اور دیا سامنے آ چکا ہے۔ چند ایک نوجوان ادیب جیسے سید کاشف رضا، اختر رضا سلیمی، خورشید اقبال، زیف سید وغیرہ بھی لکھ رہے۔ ہندوستان میں بھی مشرف عالم ذوقی اور شموئیل احمد لکھ رہے ہیں۔ 2014 میں ان کے ناول سامنے آئے ہیں۔ اس سے پہلے پیغام آفاقی لکھ چکے ہیں۔ ہاں البتہ ہم اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے چند اہم ناولوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ہندوستان میں شائع ہونے والے حالیہ ناولوں کے بارے میں پیغام آفاقی کے علاوہ مشرف عالم ذوقی، شموئیل احمد اور رحمان عباس لکھ رہے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول سنہ 2014 میں سامنے آیا تھا۔ ان کا حالیہ ناول مرگ انبوہ آیا ہے۔ کچھ اور دوست بھی لکھ رہے ہیں۔ رحمان عباس روحزن لے آئے ہیں۔ جو ہندوستان اور پاکستان دونوں طرف پڑھا جا رہا ہے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہے کئی ایک ناول اردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ پیغام آفاقی کے مکان سے لے کر انتظار حسین کے سنگھاسن بتیسی، سعید کی پُر اسرار زندگی، میرزا اطہر بیگ کا غلام باغ، اور حسن کی صورتِ حال: خالی جگہیں پُر کریں، اقبال حسن خان کا گلیوں کے لوگ اور یہ راستہ کوئی اور ہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا بہاؤ، خس و خاشاک زمانے اور غزالِ شب ہیں۔ سلیم شہزاد کا ناول پلوتا ہے۔ یہیں پر میرزا حامد بیگ کا تاریخی ناول انارکلی سامنے آیا۔ صفدر زیدی کے دو ناول چینی جو میٹھی نہ تھی اور بھاگ بھری۔ ابھی حال ہی میں نوجوان ادیب اقبال خورشید کا ناول تکون کی چوتھی جہت اور سید کاشف رضا کا ناول چار درویش اور ایک کچھوا منصۂ شہود پر آیا۔ کاشف رضا نے اس ناول پر یو بی ایل ایوارڈ بھی جیتا۔ اختر رضا سلیمی کے دو ناول جندر اور جاگے ہیں خواب میں۔ محمد عاطف علیم کے دو ناول مشک پوری کی ملکہ اور گرد باد ہے۔ علی اکبر ناطق کا ناول نولکھی کوٹھی، خالد فتح محمد کا ناول زینہ اور شہرِ مدفون، فارس مغل کا ناول ہم جان، حسن منظر کا ناول دھنی بخش کے بیٹے، انیس اشفاق کا پری ناز اور پرندے، ڈاکٹر صولت ناگی کا

شب گزیدہ سحر، زیف سید کا آدھی رات کا سورج، محمد عاصم بٹ کا ناول ناتمام اور بلوچستان سے فاروق سرور کا ناول سگ بان شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ محمد عامر رانا، محمد اقبال عابد، اے خیام اور شاعر علی شاعر کے ناول بھی شامل ہیں۔ سو یہ کہا جا سکتا ہے کہ نت نئے تجربات ہو رہے ہیں اور اردو ادب کے ناول کا سفر بخوبی جاری ہے۔ پاکستان میں خواتین ناول نگاروں کی بڑی اکثریت سرگرم عمل ہے لیکن سینئر خاتون رائٹرز جن میں کمیلہ شمسی، الطاف فاطمہ، بپسی سدھوا، زاہدہ حنا حیات ہیں لیکن ان کا کوئی کام اب سامنے نہیں آ رہا ہے۔ (فاطمہ ثریا بجیا چلی گئیں۔)

آمنہ مفتی لکھ رہی ہیں۔ نیلم احمد بشیر کا حالیہ ناول طاؤس فقط رنگ سامنے آیا ہے۔ ہندوستان سے صادقہ نواب سحر لکھ رہی ہیں۔ اکثر دوسری خواتین ناول نگار جن میں بہت سے غیر معروف نام شامل ہیں بہت کام کر رہی ہیں جو عام طور پر خواتین کے ڈائجسٹوں میں شائع ہو رہا ہے۔ اسے ہم پاپولر ادب کہہ سکتے ہیں جس میں شاہ بانو بلگرامی، عمیرہ احمد اور نمرہ احمد وغیرہ، نمایاں ہیں۔ تاہم سنجیدہ ادب میں ان کی کوئی تخلیق سامنے نہیں آئی۔ ویسے خواتین میں نسیم سید، کوثر جمال سیمیں علی، منزہ احتشام گوندل شارٹ سٹوری رائٹرز کے طور پر نمایاں ہیں۔ یہاں ایک سوال اور اٹھتا ہے جو بے حد اہم سوال ہے۔ جیسا پہلے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں ثقافتی و ادبی رجحانات سماج میں بڑھتی ہوئی نئی نظریاتی و سیاسی تبدیلیوں سے تیزی سے متأثر ہو رہے ہیں۔ اور وہی موضوعات ان ناولوں میں سامنے آ رہے ہیں۔ اس میں مثبت پہلو یہ ہے کہ مرد ناول نگاروں کی طرف سے زندگی سے متعلق، انسانی نفسیات پر اور دیگر عصری موضوعات پر فلسفیانہ انداز سے لکھا جا رہا ہے، جب کہ خواتین میں تانیثیت و نسائی حوالوں سے کام ہو رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ فہمیدہ ریاض نے اپنا ناول مکمل کیا ہے۔ زندگی نے انھیں مہلت نہ دی۔ اب یہ ناول کب شائع ہو معلوم نہیں، لیکن ان کے موضوعات ہمیشہ سے سماجی فکری تناظر میں تانیثیت کو اہمیت دیتے رہے ہیں۔ فاطمہ ثریا بجیا انھی معاشرتی اور تانیثی مسائل کو اپنے ناولوں، ڈراموں میں زیرِ بحث لا چکی ہیں۔ صرف بانو قدسیہ کچھ الگ لکھتی رہی ہیں لیکن ان کے ہاں بھی موضوع نسائیت اور مبہم مذہبی دلائل سے دور نہ رہ سکے۔

اب ادبِ عالیہ سے ہم کیا مراد لیتے ہیں اس کی تشریح اور اس پر بات اہم سوال ہے۔ کسی ترقی پسند کے ذہن سے اعلیٰ ادب مزدور اور آجر کا رشتہ اور اس کے مسائل پر آجیر کی فوقیت ہی ادب کا اہم سوال ہے لیکن کسی دوسرے ادیب کے سامنے ادب صرف جمالیاتی حظ کا نام ہے۔ وہ فلسفیانہ ردعمل اور اس سے جڑے مسائل سے منسوب و مطلوب کو غیر اہم مانتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ادب کو کسی نظریہ کے تحت نہیں دیکھتا۔ ادب بہ راہِ زندگی ہونا چاہیے اور اس میں فرسودہ و اسطوری داستانی رویوں سے نکل کر سیمابی لیکن کڑی حقیقت نگاری ادیب کا منشاء و منتہاء ہونا لازم ہے، ورنہ ادب صرف ادب ہی رہ جائے گا اور سماج کا وہ سقیم الحال حصہ ادبی افادے سے محروم رہے گا، جسے عمومی طور پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اب اس میں تخلیقی وفور کس قدر اہم ہے یہ تخلیق کار پر مبنی ہے کہ وہ کس قدر راسخ النظریہ (خالصاً ادبی معنوں میں) ہو کر مرکزی خیال کو جنم دیتا ہے اور اس کی ٹریٹمنٹ متن کو کس طرح سامنے لاتا ہے۔ ہاں جو آج کل بیانیہ میں جدیدیت کے ساتھ ترقی پسند رچاؤ سامنے آ رہا ہے وہ بہت اعلیٰ ہے۔ اردو ادب میں ناول کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ایک اور سوال طویل گفتگو کا حامل ہے لیکن مختصر عرض کروں گا کہ کیا اردو ناول اب افسانے سے کہیں دور ہے یا اپنی تاثیر میں بڑے کینوس کا احاطہ کر پا رہا ہے؟

اس سوال کو گذشتہ چند دھائیوں سے مجموعی عالمی سائنس اینڈ ٹیکنالوجیکل ڈیویلپمنٹ (تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی یا ارتقاء) کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ عالمی سطح پر پہیہ کی ایجاد کے بعد جب ٹیکنالوجیکل سائنسی پیش رفت ہوئی تو میکینکل انجینئرنگ نے زندگی کو مہمیز دی اور انسان ذہن نے جب مشین ایجاد کی تو وہ مکینیکل شعور کی بہترین امثال تھیں۔ لیکن جسامت میں بہت بڑی تھیں۔ اس کے کوئی سو سال بعد انیسویں صدی کے اختتام پر یہی انجینئرنگ اپنے الیکٹریکل دور میں داخل ہوئی تو جہاں کارکردگی میں بہتری آئی وہیں ان کی جسامت یا حجم کم ہو گئے۔ بیسویں صدی میں الیکٹرونک دور آیا تو مزید ایسا ہوا کہ جسامت و حجم اور کم ہوا، اور کارکردگی بہترین ہوتی چلی گئی۔ آج ڈیجیٹل دور ہے۔ مغرب میں پہلا کمپیوٹر آج سے کوئی ستر سال پہلے وجود میں آیا تو اس کی تاریخی حیثیت و جسامت دیکھیے۔ آج کمپیوٹر آپ کی ہتھیلی پر موبائل کی شکل میں موجود ہے۔ اب ہم نینو چپ کی طرف جا چکے ہیں اور مصنوعی ذہانت کے در کھل رہے ہیں۔ سو عالمی سطح پر ہر شعبۂ زندگی میں اور انسانی نفسیات پر اس تبدیلی کے ناقابلِ یقین اثرات آئے ہیں۔ جب ابتداء میں اساطیری کہانیاں، طلسمِ ہوش ربا اور طلسماتی کہانیاں رائج تھیں تو وہ عمر و عیار کی پٹاری کی طرح طویل، پیچ در پیچ داستانیں ہمارے ادب کا حصہ تھیں۔ اب مختصر ہوتے ہوئے آج افسانے کو بھی مائکروفکشن میں برتنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ لہٰذا وقت کی کمی، سائنسی و لسانی ارتقاء پر اختصاری انحصار، پروفیشنل لیول پر اختصار نویسی نے کہانی کو اس درجہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ انگریزی میں شارٹ سٹوری بھی بیسویں صدی کا

تحفہ ہے۔ اب فلیش فکشن یا مائیکرو فیکشن رائج ہو رہی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاری مکمل طور پر اختصار نویسی کو ہی پڑھ رہا ہے۔

ابھی کثیر تعداد میں ایسے قاری موجود ہیں جو ناول پڑھ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ناول کے بعد اسی طرح افسانہ بھی پڑھا رہا ہے لیکن ایک ارتقائی صورتِ حال ہے جو شاید اس صدی کے آخر تک ہمیں مزید مختصر کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ شارٹ سٹوریز یا مائیکرو فکشن/ افسانچے میں کچھ کہنے کو تکنیکی لحاظ سے ایک چیلنج مانا جاتا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ ٹالسٹائی کے وار اینڈ پیس، جین آسٹن کے پرائیڈ اینڈ پرے۔ جُوڈِس جیسے ضخیم ناول اب نہیں آ رہے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ کیا ناول کی شاخوں کے برگ و بار نیوکلیائی معاشرے کا منظر نامہ پیش کرنے میں کام یاب ہو رہے ہیں؟ یہاں یہ عرض کر دوں کہ یہ تجربات عالمی سطح پر تو بہت ہو رہے ہیں۔ گذشتہ برس کے نوبیل پرائز کی مصنفہ اولگا تکارزک اپنے ناول فلائٹس میں جہاں انسانی نفسیات کو پرکھا وہیں انسانی جسم، اس کی کلِپ زدہ زندگی (بندھی ہوئی زندگی...... بروچنگ لائف) موت کے متحرک اسباب اور ہجرت کے نامساعد ذہنی اثرات پر لکھا۔ تجربات ہوتے رہتے ہیں کبھی کام یاب کبھی ناکام لیکن عصری عہد کو رقم کرنے والا، یا لکھا جانے والا ادب ہی زندہ رہے گا، کیوں کہ وہ ادب بیک وقت مستقبل کی راہیں استوار کر رہا ہے اور بعد میں پڑھے جانے پر ماضی کا عکاس ثابت ہوگا۔ باقی تجربات ناکام ہو جائیں گے۔ کہانی یا ادب میں تاریخ پنہاں ہوتی ہے جو آنے والے وقت میں ادب کی تاریخ بھی بنتی ہے سو اس سے مفر نہیں کہ وہی ادب زندہ رہتا ہے جو عصری عہد کو پینٹ کرتا ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ ایک بات اور کہی جاتی ہے کہ کیا جنس اور عورت کے بغیر معیاری ناول لکھنا ممکن ہے۔ دیکھیے بنیادی بات یہ دیکھنی ہے کہ کیا جنس یا عورت کیا کسی دوسری کائنات کی مخلوق ہے، جسے ہم اپنی کہانی میں نہیں لا سکتے۔ بھئی زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں میں سے ایک بڑا ناتا تو خود عورت کی تخلیق ہے۔ اس قدر اہم موضوع سے کیسے دور رہا جا سکتا ہے۔ منٹو نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات پر کہا تھا کہ اگر عورت مرد کے سر پر سوار نہ ہوگی تو کیا مرد کے سر پر گدھے گھوڑے سوار ہوں گے؟

ہاں ادبی نقطۂ نظر سے اس تمام پہلوؤں کی لطیف جہات اور جمالیات کا خیال رکھا جانا از حد لازم ہے۔ جنسی مسائل یا علوم کی کتب میں انسانی مرد و عورت کے اعضائے مخصوصہ کی تصاویر تک شائع ہوتی ہیں تو کیا انھیں فحاشی کہیں گے ہم؟

ایک حقیقی ادیب کو اس جمالیاتی سطح کا علم ہوتا ہے اور وہ اس کا خیال بھی رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ سماجی و اخلاقی اقدار بھی کہیں ذہن میں ہوتی ہیں وہ ادیب اسے بھی دیکھتا ہے۔ لہٰذا میں قطعی طور پر جنس یا عورت کے بغیر ادب کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ ناول کے حوالے سے ایک پہلو مزید سامنے آتا ہے۔ نقاد کہتے ہیں زوال آمیز تہذیب کے بدلتے نقش کو کیا آج کے ناول کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آج کے ناول نگار اظہار کے اثرات سے کس قدر مطمئن ہیں؟

پہلا حوالہ قدرے ابہام کا شکار ہے؟ تاہم یہ کہوں گا کہ جدید موضوعات کو مشرف عالم ذوقی بڑے کینوس پر اپنے مرگ انبوہ میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔ خود میں نے اپنے حالیہ ناول ڈیئوس، علی اور دیا میں پوسٹ کالونیل اثرات کو رگیدا ہے وہیں عصری تہذیب کو زیرِ بحث لایا ہوں۔ گو اس ناول کا اسلوب نیم جدید ہے لیکن جدید عصری عہد پر مکمل گفتگو کی ہے۔ جدید اسلوب کو کاشف رضا نے برتا ہے۔ صفدر نوید زیدی نے نیوکلائی جنگ کا نقشہ پیش کیا؟ ناطق نے پارٹیشن کے بعد نوآبادیاتی پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ مشرف عالم نے مرگ انبوہ میں جدید اسلوب اور جدیدیت کے اثرات پر گفتگو کی ہے۔ رحمان عباس بالکل الگ پوسٹ ماڈرن المیہ کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے کہ آج کے ناول نگار کیا اظہار اور اس کے تاثرات سے مطمئن ہیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ کسی معاصر ادیب کا کام نہیں کہ وہ کسی دوسرے ادیب کے اسلوب اور ڈکشن پر کوئی حتمی بات کرے۔ ہاں اپنی رائے دی جا سکتی ہے۔ بنیادی طور پر ادب میں کماحقہ ابلاغ و ترسیل کا قائل ہوں اور مقصدیت کے بغیر گفتگو کو زیرِ بحث لانا فضول سمجھتا ہوں۔ بھلے وہ علامت میں ہو یا تجرید میں۔ تشکیک کا عمل آپ کی فکر میں ہونا لازم ہے لیکن الفاظ کی ترتیب مبہم نہ ہو۔ وہ نثر یا شاعری، جسے ہم افسانہ، ناول یا کسی بھی نثری حیثیت میں تخلیق کرتے ہیں یا شعری کیفیت میں ڈھالتے ہیں اگر قاری تک اپنا مکمل ابلاغ نہیں پہنچاتی تو اپنے مقاصد میں ناکام ہو جاتی ہے۔ کسی بھی تخلیق کو مجموعہ ہائے ادب کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا مقصود ہوتا ہے جس میں پہلا قدم ابلاغ، دوسرا شعوری ادبی حظ اور تیسرا بین السطور لاشعوری سطح لطیف ادبی جمالیات اور لطافت کا وہ پہلو جسے روحانی سطح پر محسوس کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں نظر آنے والے وہ تمام عناصر درست یا مکمل ہوں اور مخفی سطح پُر کیف بھی ہوں اور احساسات کو یقین کی حد تک مطمئن کریں۔ اگر یہ سب کچھ ہے تو وہ نثر کامیاب ہے۔ آج کے اردو ناولز میں ایسا چیدہ چیدہ ہی ہے۔ اس کی وجہ صرف ٹریٹمنٹ کی سطح پر سہل پسندی کہیں گے۔ ورنہ جمالیاتی سطح پر اس ادیب نے اپنا کام کیا ہوتا ہے۔

❁❁❁

ڈپٹی نذیر احمد

اردو میں وہ شخصیت جسے پہلا ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے، جس نے سب سے پہلے خواتین کے لئے ادب کی تشکیل کی، جس نے تانیثیت (نسواں) کا منشور مرتب کیا اور انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ، تعزیرات ہند، کے نام سے کیا جو سرکاری حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس شخصیت کا نام ڈپٹی نذیر احمد ہے۔ نذیر احمد کی پیدائش 6 دسمبر 1836 کو ضلع بجنور میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی سعادت علی معلم تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ دلی کے اورنگ آبادی مدرسے میں مولوی عبدالخالق سے درس لیا۔ دہلی میں زمانۂ طالب علمی میں پنجابی کڑے کی مسجد میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں دینی مدرسے کے زیادہ تر طالب علموں کو بستی کے گھروں سے روٹیاں لانی پڑتی تھی۔ نذیر احمد کو بھی اپنے کھانے کا انتظام اسی طرح کرنا پڑا۔ کہیں سے رات کی بچی ہوئی دال تو کہیں سے دو تین سوکھی روٹیاں مل جاتی تھیں۔ نذیر احمد مولوی عبدالخالق کے گھر سے بھی روٹیاں لاتے تھے۔ جہاں ایک لڑکی ان سے روٹی کے بدلے مصالحے پسواتی تھی۔ اور کبھی کبھی مصالحہ پیسنے میں سُستی کی وجہ سے انگلی پر سِل کا بٹہ بھی مار دیتی تھی۔ خود نذیر احمد نے لکھا ہے کہ: ''ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، ادھر اُن کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔۔۔۔ خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اُٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا، بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔ یہی لڑکی بعد میں نذیر احمد کی شریکِ حیات بنی۔

مدرسہ کی تعلیم کے بعد نذیر احمد نے دلی کالج میں داخلہ لیا یہاں انہیں وظیفہ بھی مل گیا۔ دلی میں 8 سال گزارنے کے بعد بسلسلہ ملازمت گجرات پہنچے۔ جہاں 80 روپے ماہوار پر انہیں نوکری مل گئی۔ اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے وہ کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ 1857ء کے انقلاب میں دلی واپس آئے۔ یہاں سے نظام دکن نے انہیں حیدرآباد بلا لیا۔ جہاں ان کی تنخواہ 1240 روپے مقرر ہوئی۔ انہیں دفاتر کا معائنہ اور کارکردگی کی مفصل روداد پیش کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ نذیر احمد نے بہت محنت اور لگن سے کام کیا اس لئے انہیں ترقی ملتی گئی۔ وہ صدر تعلقہ دار بن گئے۔ اس دوران انہوں نے نظام دکن کے بچوں کو پڑھانے کا کام بھی کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد جب جالون شہر میں تھے تو انہیں بچوں کے لئے کچھ کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی مگر وہ دستیاب نہ ہو سکیں تو انہوں نے خود بچوں کے لئے کتابیں لکھنے کا کام شروع کر دیا۔ امراءالعروس، منتخب الحکایات وغیرہ ان کی اپنے بچوں کے لئے لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بہت سے ناول تحریر کئے جن کا مقصد اصلاحی تھا اور ان ناولوں میں زیادہ زور لڑکیوں کی تعلیم وتربیت اور امورِ خانہ داری پر تھا۔ ان میں مشہور ناولوں میں 'مراۃ العروس' ان کا سب سے مشہور ناول ہے۔ جس کے کردار اکبری اور اصغری آج بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ ناول جب شائع ہوا تھا تو حکومت نے ایک ہزار روپے انعام سے نوازا تھا۔ 1869ء میں شائع ہونے والے اس ناول کو زیادہ تر لوگ اردو کا پہلا ناول مانتے ہیں۔ 'ابن الوقت' بھی نذیر احمد کا مشہور ناول ہے۔ جس میں مغربی تہذیب وتمدن کی نقالی پر طنز کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اس میں سرسید احمد خان کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مگر ڈپٹی نذیر احمد نے اس کی تردید کی ہے کیوں کہ وہ خود سرسید کی تحریک سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ سرسید کے مشن کی تبلیغ اور ترویج کے لئے ہمیشہ سرگرم رہتے تھے۔ وہ سرسید کے تمام نظریات اور تصورات کے قدردان تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اہم قومی خدمات بھی انجام دیں ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناولوں کے علاوہ جو اہم علمی کام کئے ہیں ان میں قرآن کا ترجمہ، قانون انکم ٹیکس، قانون شہادت بہت اہم ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی بیشتر کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ان کی کتابوں کا انگریزی کے علاوہ پنجابی، کشمیری، مراٹھی، گجراتی، بنگلہ، بھاکا وغیرہ میں ترجمے ہوئے۔ 'مراۃ العروس' کا ترجمہ انگریزی میں 1903ء میں لندن میں شائع ہوا۔ 1884ء میں 'توبۃ النصوح' کا ترجمہ سر ولیم میور کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی ادبی اور مغربی خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔ آخری عمر میں ڈپٹی نذیر احمد پر فالج کا حملہ ہوا اور 3 مئی 1912ء میں دلی میں وفات پا گئے۔

علاوہ ازیں توبۃ النصوح یہ ان کا تیسرا ناول تھا۔ جس کو ان کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ یہ ناول 1877ء میں شائع ہوا۔ یہ اولاد کے بارے میں ہے۔ اس ناول کے ذریعہ یہ حقیقت روشن کی گئی ہے کہ اولاد کی محض تعلیم ہی کافی نہیں ہے۔ اس کی پرورش اس طرح ہونی چاہئے کہ اس میں نیکی اور دینداری کے جذبات پیدا ہوں۔ یہ ناول ایک مطالعے کی شکل میں ہے۔ اس میں انہوں نے ایک خاندان کے سربراہ نصوح کی توبہ کے بارے میں لکھا ہے جسے ہیضہ ہو جاتا ہے اور بسترِ مرگ پر غش کی حالت میں اپنی عاقبت کے حالات دیکھتا ہے اور گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد اپنے بیوی اور بچوں کو راہِ راست پر آنے کی تلقین کرتا ہے۔ چھوٹے بچے اس کی بات مان جاتے ہیں مگر بڑے ضد پر قائم ہیں۔ بڑا بیٹا ایک مرتبہ زخمی ہو کر گھر لوٹتا ہے اور زخم کی تاب نہ لا کر دم توڑ دیتا ہے۔ اس پوری کتاب میں گھریلو ناچاقیوں کو ختم کرنے کی کوشش اور اپنے بچوں کو کیسے راہِ راست پر لائیں بتایا گیا ہے۔ مکمل کتاب بارہ فصلوں میں ہے۔